روشن علی بھیم جی ۱۹۶۳ء کے ای ایف یو کنونشن میں کامرس منسٹر وحید الزماں صاحب کا استقبال کر رہے ہیں
یہ تقریب بیچ لگژری ہوٹل کراچی میں منعقد ہوئی تھی

روشن علی بھیم جی ۱۹۶۶ء میں صدر ایوب سے ستارۂ قائد اعظم کا اعزاز وصول کرتے ہوئے

پاکستان میں بیمے کی صنعت کے پہل کار

این اے قاضی

جیسا کہ ہم نے دیکھا، ای ایف یو پاکستان کی سب سے پُرانی بیمہ کمپنی ہے، ایک درمیانے درجے کی کمپنی جو اس وقت بھی مسلمانوں کی ملکیت تھی جب برِصغیر کی تقسیم نہیں ہوئی تھی۔ اس لحاظ سے ای ایف یو یہ دعویٰ کرنے میں حق بجانب ہوگی کہ اس ادارے نے پاکستان میں بیمے کی قومی صنعت کے لیے گہوارے کے فرائض انجام دیے ہیں۔ ۱۹۸۲ء میں جب ای ایف یو اپنی 'گولڈن جوبلی' منارہی تھی، جناب این اے قاضی نے، جو نہ صرف ایک طویل عرصے تک ای ایف یو سے منسلک رہ چکے تھے بلکہ متفرق پاکستانی بیمہ کمپنیوں میں کام بھی کر چکے تھے اور انھی دنوں نیشنل انشورنس کارپوریشن کے چیئرمین کے عہدے سے فارغ ہوئے تھے، ای ایف یو میں اپنے پرانے ساتھیوں کو مبارک باد پیش کی تھی۔ انھوں نے اپنے پیغام میں جہاں بہت سے باتیں کہی تھیں یہ بھی فرمایا تھا کہ ''ای ایف یو کی ایک اور بڑی کامیابی، جس پر یہ ادارہ بجا طور پر فخر کر سکتا ہے، یہ بھی کہ اس نے اتنے سارے تجربہ کار افراد تیار کیے ہیں جو مقامی اور بین الاقوامی اداروں کے کام آئے ہیں۔ ایک وقت وہ بھی آیا تھا جب پاکستان کی بہت سی بیمہ کمپنیوں کے سربراہ ماضی میں ای ایف یو کے کارکن رہے تھے۔ صرف یہی ایک بات اس ادارے کے لیے ہمیشہ سر اُٹھا کے چلنے کے لیے کافی ہوگی۔ میرے لیے یہ بات باعثِ فخر ہے کہ میری بیمے کی صنعت میں کاروباری زندگی کا ایک بڑا عرصہ ای ایف یو میں گزرا تھا اور یقیناً وہ عرصہ میری زندگی کا شان دار زمانہ تھا۔ میں آج بھی ایسٹرن فیڈرل خاندان سے قربت محسوس کرتا ہوں۔''

قاضی صاحب راجستھان کے شہر اُدے پور میں پیدا ہوئے اور ای ایف یو میں شمولیت سے پہلے ہی بیمے کی صنعت سے منسلک تھے۔ اپنے مولد میں ابتدائی تعلیم کے بعد وہ مزید تعلیم کے لیے جے پور چلے گئے تھے مگر اپنے والد کی ناوقت موت کی وجہ سے ان پر اپنے خاندان کی کفالت کا بوجھ آ پڑا تھا اور ان کو ملازمت کرنا پڑی۔ ان کے ایک دوست ایک بیمہ کمپنی میں جس کا نام فری انڈیا جنرل انشورنس کمپنی تھا اور جس کا صدر دفتر خان پور میں تھا، برانچ منیجر تھے۔ انھوں نے قاضی صاحب کو اس کمپنی میں اپنی قسمت آزمانے کا مشورہ دیا۔ انھوں نے اپنے دوست کا مشورہ قبول تو کر لیا مگر ان کے اہلِ خاندان اس ملازمت کے خلاف تھے اس لیے کہ ان کے ہاں کے تقریباً سارے مرد سرکاری ملازمت کو پسند کرتے تھے، یا تو پولیس کے محکمے میں یا پھر کسی اور سرکاری ادارے میں۔ بہرحال، اہلِ خاندان نے آخرکار ہتھیار ڈال دیے اور این ای قاضی ایک انشورنس کلرک بن گئے۔

جب ہم ان سے کاروباری مصروفیات کی بات کرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں:

''صرف تین برس کے عرصے میں مجھے کافی ترقی ملی اور میں سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر فائز ہو گیا، بلاشبہ اس کامیابی میں میرے دوست کا بڑا ہاتھ تھا۔ یہاں سچ مچ سب کچھ مجھے بالکل ابتدا سے کرنا پڑا، یہ ایک جامع نوعیت کا دفتر تھا یعنی یہاں جنرل کے علاوہ زندگی کے بیمے کا بھی کاروبار ہوتا تھا۔ لہٰذا مجھے انشورنس کی تمام اقسام کے تجربے کا ایک اچھا موقع ملا تھا۔ میں ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند تک اس ادارے میں بہت خوش تھا۔ میرے تمام اعزہ واقارب نے ہجرت کا فیصلہ کیا اور سب کراچی میں جا آباد ہوئے۔ میں اجمیر سے ۱۶ میل کے فاصلے پر مقیم رہا اور چوں کہ میرے دوست مجھ پر بہت مہربان تھے اس لیے مجھے ہمت نہیں ہوئی کہ میں ان سے جدا ہوتا اور ایک اَن دیکھے مستقبل کی طرف کوچ کرتا۔ مگر میرے بھائی جو کراچی میں مقیم تھے مجھے تار پر تار بھیجتے کہ میں کراچی آجاؤں اور آخر کار مجھے مجبور ہونا ہی پڑا۔ میں ۱۹۵۰ء میں کراچی پہنچا اور حیدرآباد میں اپنے سسرال میں مقیم ہوا۔ چند دنوں بعد ہی اپنے بھائی اور دوسرے اقربا سے ملاقات کے لیے میرا کراچی جانا ہوا اور مجھے مشورہ دیا گیا کہ میں ای ایف یو کے دفتر جاؤں۔ ان کے خیال کے مطابق، چوں کہ اس کا دفتر حال ہی میں کلکتے سے کراچی منتقل ہوا تھا اس لیے امکان تھا کہ وہاں ملازمت کے مواقع ہوں۔ ان دنوں ای ایف یو کا دفتر لائڈز بینک بلڈنگ میں تھا اور میں انتظار گاہ میں بیٹھا تھا کہ میرے عم زاد اوپر گئے تاکہ معلومات حاصل کریں۔ قصہ مختصر، تھوڑی ہی دیر میں مجھے اوپری منزل میں طلب کیا گیا اور میری ملاقات جناب اختر آزاد اور مسٹر بیکسٹر سے ہوئی جو اس وقت جنرل منیجر تھے۔ صرف آدھے گھنٹے کے اندر مجھے سینئر کلرک کی ملازمت مل گئی اور اس بات کا امکان بتایا گیا کہ تین ماہ کے عرصے تک میری کارکردگی کو پرکھا جائے گا اور اگر میں ان کی توقعات پر پورا اُترا تو جونیئر افسر کے عہدے پر ترقی مل جائے گی۔ میرے پاس نہ کوئی مدد تھی نہ سفارش پھر بھی وہ سب بہت مہربان تھے، بالخصوص جناب اختر آزاد نے میرے لیے بہت کچھ کیا۔ انھیں مجھ پر بہت اعتماد تھا اور انھوں نے مجھے مختلف قسم کے کام دیے اور سب بڑھ کر بات یہ تھی کہ انھوں نے مجھے ذمے داریاں بھی سونپیں۔ ظاہر ہے کہ وہ میرے کام سے بہت مطمئن تھے اس لیے کہ ملازمت کے ایک سال بعد ہی مجھ کو سینئر آفیسر بنا دیا گیا۔''

جب میں نے ای ایف یو میں ملازمت شروع کی اسی زمانے میں قاضی صاحب ای ایف یو چھوڑ کر مشرقی پاکستان کی بڑی کمپنیوں میں سے ایک، ایسٹرن انشورنس کمپنی میں چلے گئے، جہاں وہ بہت کامیاب رہے۔ پہلے تو وہ کراچی کے دفتر میں منیجر ہوئے اور رفتہ رفتہ مغربی پاکستان کی تمام شاخوں کی نگہداشت کرتے رہے۔ بعد میں وہ جنرل منیجر ہو کر چاٹگام چلے گئے۔ اس کمپنی کے مالکان بہت رسوخ والے تھے اور تقسیم سے قبل بھی سیاست میں نہ صرف عملی حصہ لیتے تھے بلکہ انھیں وزارتیں بھی ملی تھیں۔

بنگلہ دیش کے قیام کے بعد قاضی صاحب کراچی واپس آ گئے اور انھوں نے PIC میں جناب محمد صادق صاحب کی جگہ سنبھال لی جن کا تبادلہ سوڈان ہو گیا تھا۔ بعد میں قاضی صاحب PIC کے چیئرمین کے عہدے پر فائز ہوئے جو اس زمانے کا انشورنس کا سب سے بڑا عہدہ تصور کیا جاتا تھا۔ اپنی تحقیق کے دوران میں نے قاضی صاحب سے بھی رابطہ کیا تھا اور از راہِ مہربانی وہ خود چل کر ہوٹل میں مجھ سے ملنے آئے۔ انھوں نے اپنے ای ایف یو کے دوستوں کی بہت تعریف کی۔ ان سے بات کے دوران مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا گویا میں گوشت پوست میں مجسم انشورنس کی کسی لغت سے مخاطب ہوں۔ جہاں انھوں نے اور باتیں بتائیں، انھوں نے یہ بھی بتایا کہ جب ایک کے بعد دوسرا افسر استعفیٰ دے کر نئی بننے والی کمپنیوں میں بڑے عہدوں پر جا رہا تھا اس وقت کے جنرل منیجر جناب کے ایف حیدر کا ردِعمل کیا ہوتا تھا۔ قاضی صاحب کے مطابق، ''ان دنوں پاکستان میں ای ایف یو ہی سب سے بڑی بیمہ کمپنی تھی اور سارے قابلِ فخر تجربہ کار افسر اسی میں کام کرتے تھے۔ اختر آزاد، ہاشم، تحسین احمد، آغا رضا وغیرہ جن کا سچ مچ انشورنس کی صنعت میں کوئی مقام تھا، ای ایف یو ہی میں تھے اور بالآخر سب ہی چھوڑ کر چلے گئے۔ اور ایسا لگتا تھا کہ کے ایف حیدر کو کسی کی پروا ہی نہیں۔ انھوں نے کسی کو بھی روکنے کی کوشش نہیں کی۔ انھوں نے سب کو کامیابی کی دعائیں دیں۔ ان کے نزدیک پاکستان میں بیمے کی صنعت کی بڑی اہمیت تھی، ای ایف یو سے بھی زیادہ۔ یہ بہت بڑی بات تھی حالاں کہ انھیں معلوم تھا کہ لوگ ان پر اس کمپنی کے مفاد کو نظر انداز کرنے کا الزام دھرتے تھے بھی جس کی بنیاد بھی انھیں کے ہاتھوں رکھی گئی

تھی اور جس کا مفاد ان کے دل سے بھی زیادہ قریب تھا۔ میں نے کبھی اس نوع کے خیالات سے اتفاق نہیں کیا اس لیے کہ وہ دور اندیشی اور فراخ دلی کے رویّے سے کام لیتے تھے۔ پاکستان میں بیمے کی صنعت پر ان کا بڑا احسان ہے۔ یہ ہماری بڑی خوش قسمتی تھی کہ ہمارے پاس پاکستان میں بیمے کی صنعت کے اعلیٰ اور بہت اچھے اور تجربے کار افسران تھے۔ مثال کے طور پر 'نیو جوبلی' (اب مسلم) کے سجالی۔ حبیب کے دُباش، 'پریمئر' کے نورانی اور اے یو صدیقی کے نام میرے ذہن میں ابھرتے ہیں۔ چودھری نے بھی ای ایف یو سے آغاز کیا تھا۔ اختر آزاد اور ہاشم، جو بعد میں 'مسلم' میں چلے گئے تھے، یہ سب کے سب اپنی کاروباری نشوونما کے لیے ای ایف یو کے احسان مند تھے۔ صنعت کے زیادہ تر تجربے کار اور اعلیٰ افسران پہلے ایسٹرن فیڈرل میں تھے اور بعد میں نئی بننے والی کمپنیوں میں چلے گئے تھے۔ ہر وہ شخص بیمے کی صنعت پر جس کی گہری نظر ہے بغیر کسی تامل اور تذبذب کے اس بات سے اتفاق کرے گا کہ وہ ایسٹرن فیڈرل ہی تھی جس نے ملک میں بیمے کی صنعت کی تعمیر کی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تقسیم کے وقت لاہور کی مسلم انشورنس کمپنی اور ایک چھوٹی سی کمپنی 'کوآپریٹو' بھی تھی مگر اس وقت ایسٹرن فیڈرل ہی حقیقی معنوں میں بڑا اور محکم ادارہ تھا۔ اس لیے کہ ان کی پشت پر نواب بھوپال، آغا خان، حتیٰ کہ نظام حیدرآباد جیسی بڑی رسوخ والی شخصیات تھیں۔ ای ایف یو ہی مسلمانوں کا اصل اور سرخیل ادارہ تھا۔ اور جیسا میں نے ہمیشہ کہا ہے، یہی لوگ بنیاد کار تھے۔

ان میں سے ایک این اے قاضی تھے۔ ایسٹرن انشورنس کمپنی کے سربراہ، PIC کے ڈپٹی منیجنگ ڈائریکٹر، NIC کے سربراہ اور پھر انھوں نے ریلائنس کی بنیاد رکھنے میں مدد کی۔ قاضی صاحب ایسے اعلیٰ درجے کے مستعد اور ذمے دار انسان ہیں جس کے پیشِ نظر معیار سب سے پہلی چیز ہوتا ہے۔ اور ان کی یہ بھی خوبی ہے کہ وہ دوسروں کے نکتہ ہائے نظر کا احترام بھی کرتے ہیں بشرطے کہ وہ بنیادی طور پر حقیقت اور اعداد و شمار پر مبنی ہوں۔

جب میں بیمے کی صنعت کے ماضی پر نظر ڈالتا ہوں، اور پانچویں عشرے اور چھٹے عشرے میں قائم ہونے والی نئی کمپنیاں جیسے 'نیو جوبلی'، 'پریمئر'، 'آدمجی'، 'سینٹرل'، 'ایسٹرن' اور 'یونائیٹڈ' وغیرہ کا خیال آتا ہے تو انھوں نے جن جن افراد کا تذکرہ کیا، تقریباً سب ہی میرے ذہن کے پردے پر ابھرتے آتے ہیں۔ ان ساری کمپنیوں اور افراد ہی نے مل جُل کر پاکستان میں بیمے کی صنعت کو مستحکم بنیادوں پر استوار کیا ہے۔

ان ناموں میں سے کچھ کی شخصیتوں، کردار اور کارکردگی پر میں آگے چل کر روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا۔ میں ان لوگوں سے تہِ دل سے معذرت چاہوں گا جن کے تذکرے رہ جائیں اس لیے کہ اگر سب کا تذکرہ کیا جائے تو خود اس کے لیے ایک ضخیم کتاب درکار ہوگی۔

محمد چودھری

محمد چودھری کی منفرد کارکردگی کا میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں۔ جب میری ان سے پہلی ملاقات ہوئی وہ پریمئر کے منیجر تھے اور ان کو بیمے کی دنیا میں Marine اور Hull کا سب سے ماہر انڈر رائٹر مانا جاتا تھا۔ اب تو وہ بہت آگے جا چکے ہیں اور جس طرح انھوں نے 'اپنی' آدمجی انشورنس کو بامِ عروج پر پہنچایا ہے اس کی مثال نہیں ملتی اور یہ بڑا کارنامہ ہے، اور جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں ان کے مخالفین نے بھی ان کی کامیابی کا اعتراف کیا ہے۔

محمد چودھری آسام میں پیدا ہوئے، کلکتہ یونی ورسٹی میں فلسفہ پڑھا، تقسیمِ ہند سے کچھ عرصہ قبل ۱۹۴۷ء میں انھوں نے بی اے آنرز کیا۔ میں جب اگست ۱۹۹۷ء میں ان کے دفتر میں ملاقات کے لیے پہنچا تو انھوں نے اپنے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے بتایا، ''میں نے ایسٹرن فیڈرل میں یکم ستمبر ۱۹۴۷ء سے فروری ۱۹۴۹ء تک ملازمت کی تھی۔'' میں ان سے درجنوں بار مل چکا ہوں مگر یہ پہلا موقع تھا جب میں نے ان سے خصوصی طور پر ای ایف یو سے رشتے اور اس سے منسلک یادوں کے بارے میں استفسار کیا تھا۔ انھوں نے بڑی فراخ دلی اور گرمجوشی سے جواب دیے تھے اور اس گرمجوشی میں شاید ہمارے چالیس برس کے ذاتی تعلقات اور سلام دعا کا بھی دخل رہا۔ انھوں نے کہا، ''میرے ایک چچا

ایسٹرن فیڈرل میں سیلز آفیسر کے طور کام کرتے تھے اور انھیں نے مجھے اس ادارے سے متعارف کرایا۔ تھا۔ انھوں نے کمپنی کو ایک درخواست لکھ کر بھیجی اور فوراً مجھے انٹرویو کے لیے بلایا گیا۔ ان دنوں کمپنی کا دفتر ایک عمدہ عمارت، اسٹینڈرڈ بلڈنگ، کلکتے میں ڈلہوزی اسکوائر، دوسری، منزل پر واقع تھا۔ میرا تعارف جناب ایم اے ہاشم سے کرایا گیا جو میرین کے سپرنٹنڈنٹ تھے، اور جناب مقبول انصاری سے جو فائر ڈپارٹمنٹ کے سپرنٹنڈنٹ تھے۔ انھوں نے مجھے کمپنی کے ڈپٹی جنرل منیجر Mr Spooner کے پاس بھیجا۔ انھوں نے مجھ سے کچھ مشکل نوعیت کے سوالات کیے جواب مجھے یاد نہیں اور چند لمحوں بعد انھوں نے فرمایا کہ مجھے ملازمت دی جا رہی ہے۔ اس وقت صبح کے ساڑھے دس بجے تھے۔ ہندوستان کے بٹوارے کی خبر آ چکی تھی۔ میرے والدین اس وقت آسام میں تھے اور میں نے ان کو بتایا کہ میں اس وقت ایک افراتفری کی کیفیت میں تھا۔ یہ سن کے مجھے بڑی حیرت ہوئی جب انھوں نے کہا کہ میں یہ ملازمت فوراً شروع کر سکتا ہوں۔ اس طرح ساڑھے دس بجے میں ملازمت شروع کر چکا تھا۔ وہاں کام کرنے والے بڑے ملنسار تھے۔ کچھ نے تو مجھے ایسی نظروں سے دیکھا گویا وہ میری تعلیمی قابلیت سے کچھ مرعوب نہ تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب روایتی طور پر ان جیسے، یعنی دفتری کلرک، لوگوں کے نزدیک اعلیٰ تعلیم سے زیادہ تجربہ اہم ہوتا تھا۔ جب میں نے چیف کلرک کو، جنھیں اندو بابو کے نام سے پکارا جاتا تھا، بتایا کہ میں فلسفے میں بی اے کا امتحان دے کر فارغ ہوا ہوں، انھوں نے فوراً کہا، ''تم فلسفے میں بی اے آنرز کے ساتھ یہاں کیا کرنے آئے ہو؟'' میں نے جواب دیا، میں نے کمپنی کی ملازمت اختیار کر ہی لی ہے، لہٰذا مجھے بتایئے کہ مجھے کیا کرنا ہوگا۔ میں نے انشورنس کا آدمی بننے کا ارادہ کر لیا ہے اور میرے خیال میں یہ ایک اچھا فیصلہ ہے۔ اور جہاں تک میری تعلیمی قابلیت کا سوال ہے تو میں اسے عقل مندی سے استعمال کرنے کی کوشش کروں گا۔ ہمارے آپس کے تعلقات بہتر ہو گئے، حالاں کہ سب ہمہ وقت بنگالی زبان میں بات کرتے اور میں اس میں اتنا ماہر نہیں تھا۔ پہلے تو مجھے ری انشورنس ڈپارٹمنٹ میں پھر فائر ڈپارٹمنٹ میں تعینات کیا گیا۔ اور جب انھیں معلوم ہوا کہ میری انگریزی کچھ زیادہ ہی اچھی ہے تو مجھے خط کتابت پر لگا دیا گیا۔ مختلف نوعیت کے کام کرنے کی وجہ سے میری تربیت اچھی ہو گئی اور مجھے ہر طرح کے کام دیے جانے میں اپنا فائدہ ہی نظر آیا۔ اس کو پڑھنے والے لوگوں کو اندازہ ہو جائے گا کہ طرح طرح کے کام دیے جانے پر مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا اس لیے کہ اس طرح میں بہت کچھ سیکھ سکوں گا۔ میری سب سے بڑی ذمے داری یہ تھی کہ مجھے کمپنی کے کھاتے داروں سے معاملت کرنا تھی۔ میرے سینئر ساتھی مجھ کو بنگالی زبان میں بتاتے کہ وہ کھاتے داروں سے کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں، اور میرا کام یہ تھا کہ میں کمپنی کا مدعا انگریزی میں لکھ دوں۔ اگر کھاتے دار کی جانب سے منفی جواب آتا تو مجھے ڈانٹا جاتا کہ میں نے کھاتے داروں کو ای ایف یو کی تجاویز کو بہتر طور پر سمجھایا نہیں۔ تو میں بیٹھ کر غور کرتا، دوبارہ لکھتا اور بالآخر مطلوبہ نتائج نکل آتے۔ ایک اور بات تھی جس کا مجھے جلد احساس ہو گیا تھا کہ وہ لوگ جو میرے استاد تھے وہ انشورنس کے عملی پہلو سے بخوبی واقف تھے مگر ان کو تھیوری کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں تھیں۔ انھیں اس بات کا اندازہ ہی نہیں تھا کہ فائر انشورنس کے اصل مقاصد کیا ہیں؟ انھیں معلوم تھا کہ پٹ سن کے گوداموں کو فائر انشورنس کی ضرورت ہوتی ہے مگر وہ اس سے منسلک دوسرے خطرات کا ادراک نہیں کر پاتے تھے۔ ان دنوں کلکتے میں فسادات ہو رہے تھے مگر فسادات کی صورت میں ہونے والے نقصانات کا بیمہ نہیں کیا جاتا تھا۔ مگر میرا کھوجی ذہن مجھ سے سوال کرتا کہ ہماری کمپنی فسادات میں ہونے والے نقصانات کا بیمہ کیوں نہیں کرتی۔ سیلاب آتے تھے تو پھر سیلابی نقصانات کا بیمہ کیوں نہیں کیا جاتا۔ ری انشورنس کے بہی کھاتوں پر کام کے دوران میں نے دیکھا کہ خال خال موقعوں پر اس قسم کے بیمے دیے جاتے رہے ہیں، تو بڑے پیمانے پر ایسا کیوں نہیں کیا جاتا؟ میں نے اس بات کا تذکرہ اپنے سینئر لوگوں سے کیا اور بالآخر انصاری صاحب سے بھی بات کی۔ انھوں نے میری بات کو بہت سراہا اور شکایتاً کہا کہ کسی نے پہلے اس طرح کیوں نہیں سوچا۔ انھوں نے بلند آواز میں کہا، ''مجھ سمیت ہم سب کو شرم آنی چاہیے۔ اس نوجوان کو کمپنی میں آئے ہوئے ابھی صرف دو ماہ ہوئے ہیں اور یہ ہم سب کو بتا رہا ہے کہ ہمیں پانچ دس برس پہلے سے کیا کچھ کرنا چاہیے تھا۔''

جب محمد چودھری نے یہ واقعہ بیان کیا تو ان کی آنکھوں سے جذبات کے شعلے نکلتے دکھائی دے رہے تھے۔ ان کو یہ کہتے ہو
بہت مسرت ہو رہی تھی کہ اپنے پیشے کی ابتدا ہی سے وہ دوسروں کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہوگئے کہ وہ ہمیشہ اپنے ساتھیوں سے چند قد
آگے ہی رہیں گے۔ انھوں نے ای ایف یو کے چیئر مین سے اپنی پہلی ملاقات کی خوب صورت کہانی بھی سنائی جس کو میں نے ان کے خا
میں درج کیا ہے۔ اور انھوں نے کمپنی میں کام کرنے والے افسران کے لیے توصیفی کلمات بھی کہے۔ ''ایسٹرن فیڈرل کے پاس عمدہ افسرا
پر مشتمل جماعت تھی۔'' انھوں نے کہا، ''ایک نوجوان کی حیثیت سے ان میں سے کئی سے میں بہت متاثر تھا۔ لیکن جس بات نے مجھے زیا
متاثر کیا تھا وہ یہ تھی کمپنی کو تمام بڑی انگریزی کمپنیوں کے نمونے پر استوار کیا گیا تھا۔ ان کے بورڈ کے ڈائیریکٹروں میں بہت معروف ومتا
لوگ شامل تھے۔ کمپنی مقبول تھی۔ بہت مقبول۔ مجھے زندگی کے بیمے کی بابت زیادہ معلومات نہیں تھیں مگر کم ازکم جنرل بیمے کے لیے وہ بہت
بہت ہی مقبول کمپنی تھی۔ مگر جو بات مجھے پسند نہیں آئی وہ اس کے رجسٹرڈ دفتر کی چاٹگام منتقلی اور کمپنی کا پاکستان ہجرت کرنے کا فیصلہ تھا۔ اس
میں مجھے کوئی عقل مندی دکھائی نہیں دی، کم ازکم اس زمانے میں۔ ذاتی طور پر میں یہی پسند کرتا کہ کمپنی کلکتے ہی میں رہتی، ایک ہندوستا
کمپنی کی حیثیت میں اس لیے کہ جنھوں نے اس کی تشکیل کی وہ سب ہندوستان ہی سے تعلق رکھتے تھے۔ جن لوگوں نے اس میں بڑی ما
شمولیت کی، جیسے نواب بھوپال، وہ ہندوستان ہی میں رہے، یا نظام حیدر آباد۔ میرے اپنے خیال کے مطابق کمپنی موقعے سے بھاگ رہی تھی
اس میں شک نہیں کہ چند برسوں بعد اس کو قومی ملکیت میں لے لیا جاتا مگر اس وقت تک تو کسی کو اس کا گمان بھی نہیں تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ
میرا تبادلہ ڈھاکا یا چاٹگام کردیا جائے گا۔ میں اس کے خلاف تھا۔ میں کراچی جانا چاہتا تھا مگر انھوں نے اصرار کیا کہ میں بنگال ہی میں رہوں
چاٹگام یا ڈھاکے میں۔ مگر میں تو شہری آدمی ہوں۔ میں ای ایف یو میں کلکتے ہی میں رہتا۔ مگر چوں کہ میرے پاس کمپنی کو خیر باد کہنے کے علاو
اور کوئی راستہ نہ تھا۔ مجھے کمپنی کے کسی آدمی سے کوئی شکوہ نہ تھا، بس ان کے کلکتے سے نکل جانے کے فیصلے سے اتفاق نہیں تھا۔ اس وقت بہت
سی باتوں کا مجھے ادراک نہیں تھا جو بعد میں میری سمجھ آئیں۔''

یہ تھا محمد چودھری کا ای ایف یو کے اسٹیج پر ظہور۔ انھوں نے کلکتے میں 'نارچ یونین' مین ملازمت کرلی، مزید تربیت کے لیے بمب
بھیجے گئے اور پھر پاکستان کے نئے دارالحکومت میں کمپنی کی شاخ کھولنے کے لیے ان کو کراچی تبدیل کردیا گیا۔ یہ مارچ ۱۹۴۹ء کا واقعہ ہے
عین اس زمانے کا جب ان کے ای ایف یو کے پرانے ساتھی کلکتے سے کراچی پہنچے تھے۔ وہ ۱۹۵۲ء تک 'نارچ یونین' میں رہے۔ انھی دنو
اسٹیٹ بینک کے پہلے گورنر جناب زاہد حسین نے ان کو اپنے گھر بلایا اور 'پریمیئر انشورنس کمپنی' میں شمولیت پر اکسایا اور وہ راضی ہو گئے۔
انھوں نے اسسٹنٹ منیجر کی حیثیت سے شمولیت اختیار کی اور یہ ان کا پہلا منیجری کا عہدہ تھا۔ ''اس کے بعد سے'' مسکراتے ہوئے محمد چودھر
نے کہا، جب میں اور وہ ان کے دفتر سے ملحق کھانے کے کمرے میں دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے'' میں نے مرحلہ وار ترقی کی ہے، پہلے پریمیئر
انشورنس کمپنی کا جنرل منیجر بنا اور اس کے بعد، جو کچھ آج میں ہوں۔''

ایم اے چشتی

میں نے جناب چشتی کا پہلے بھی تذکرہ کیا ہے، وہی ایم اے چشتی جو آج کل نسبتاً ایک چھوٹی پاکستانی کمپنی ڈیلٹا انشورنس کمپنی کے
مینیجنگ ڈائریکٹر ہیں۔ یہ پاکستان میں انشورنس کے ان بزرگ اعلیٰ افسروں میں سے ہیں جو اس صنعت کے اوّل وقت سے اہم رہے ہیں
اور جن کو بہت احترام اور توقیر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اجمیر کی پیدائش، آگرہ یونی ورسٹی کے گریجویٹ مشکور چشتی نے بھی اپنا پیشہ ورانہ سفر
ایسٹرن فیڈرل میں ایک جونیئر آفیسر کی حیثیت سے ۱۹۴۷ء میں شروع کیا تھا۔ وہ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں کراچی آچکے تھے مگر، جیسا کہ انھوں مجھے
بتایا، وہ اپنا شہر اجمیر چھوڑنے پر بالکل خوش نہیں تھے۔ ''یہ شہر سات سو برس سے زیادہ قدیم ہے۔'' انھوں نے کہا، جب پاکستان کی پچاسویں

ں گرہ کے دن، ۱۴؍اگست ۱۹۹۷ء کو ان سے ملنے گیا۔ قدرتی طور پر ہم نے تقسیم کے دنوں کے بارے میں اور ان کے اپنے مولد کو چھوڑ نے بارے میں باتیں کیں۔ ''میں نے اس شہر کو بہت یاد کیا، جو بہت مشہور ہے، جس کو سارے مسلمان جانتے ہیں جہاں ایک مشہور صوفی جہ معین الدین چشتی دفن ہیں اور میرے خاندان کے بزرگ جس سے وابستہ رہے ہیں۔ ۶؍رجب کو، صوفی صاحب کی برسی پر پورے وستان، سری لنکا، برما اور دنیا کے بہت سے ملکوں سے لوگ ان کے مزار پر حاضری دینے کے لیے جوق در جوق آتے ہیں۔ میں بھی ذاتی پر اس مقام سے تقرب رکھتا ہوں۔ ہاں اجمیر اور اپنے خاندان کے ایک بڑے حصے کو چھوڑنا میرے لیے بہت تکلیف دہ تھا اس لیے کہ ے والد اور بڑے بھائی نے آگرہ نہیں چھوڑا۔ میرے ایک اور بھائی نے جو عمر میں مجھ سے کچھ بڑے تھے، ہجرت کا فیصلہ کیا اور ان کے اہ میں نے ہجرت کی۔ کراچی آکر میں نے ملازمت کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کیا اور کامیاب ہوا۔ دسمبر ۱۹۴۷ء میں نے ایسٹرن رل انشورنس کمپنی میں جونیئر آفیسر کی حیثیت سے شمولیت اختیار کرلی۔ اس وقت ای یف یو، حبیب انشورنس اور اسکاٹش یونین انشورنس کی زکہ شاخ ہوا کرتی تھی جس کے منتظم جناب اختر آزاد تھے۔ مجھے حادثاتی بیمے کی ذمے داری سونپی گئی، جو اس زمانے میں زیادہ تر موٹر کے ے پر مشتمل تھی۔ ۱۹۴۸ء تک Mr John Plump لندن سے اسکاٹش یونین انشورنس کے جنرل منیجر کے عہدے پر تعینات ہوکر آگئے طرح میں نے کچھ دن تین افسروں کی ماتحتی میں کام کیا، ای ایف یو کے جناب اختر آزاد، مسٹر پلمپ اور حبیب انشورنس کے منتظم۔ یہ لہ اس وقت اختتام کو پہنچا جب ۱۹۴۹ء میں ای یف یو کا صدر دفتر کلکتے سے کراچی منتقل ہوگیا اور ہم، یعنی کراچی شاخ کے تمام کارکنان ساتھ لائڈز بینک بلڈنگ، میکلوڈ روڈ، منتقل ہوگئے۔ یہ عمارت اب بھی اپنی اصلی حالت میں موجود ہے، شاید اس میں موجود لفٹ بھی وہی ۔ سو وہ سب آگئے، مسٹر ہیکسٹر، مسٹر آئیون سمیت۔ ایک اور عظیم اور معروف شخصیت، جناب شعیب قریشی، کچھ دنوں کے لیے ای ایف یو ریزیڈنٹ ڈائریکٹر رہے۔ مجھے اپنے کام میں بہت مزہ آرہا تھا اور یقین تھا کہ میرا مستقبل تابناک ہوسکتا ہے۔ لیکن اچانک اصفہانی حب کے ایک رشتے دار اور شیرازی صاحب کے بھی ایک عزیز جونیئر آفیسر بنا دیے گئے اور جلد ہی دونوں کو سینئر آفیسر کے عہدے پر ترقی ے دی گئی مگر دونوں میری ماتحتی میں کام کرتے رہے۔ میں نے بارہا اس بے ضابطگی کے بارے میں، جو جاگیرداری کے دور کی یادگار لگتی ں، انتظامیہ کی توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی مگر ایسا لگتا تھا کہ کوئی پرسانِ حال نہیں۔ میرے لیے کوئی اور راستہ نہیں تھا اور نہایت افسوس ساتھ ای ایف یو کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔''

اس کے بعد کچھ دنوں چشتی صاحب نے لندن لنکا شائر اور امریکن انٹرنیشنل انڈر رائٹرز میں کام کیا کے جن کے دفاتر لاہور میں تھے ں کے بعد ان کو ایمپلائرز لائبیلیٹی انشورنس نے، جو ان دنوں بہت مشہور کمپنی ہوا کرتی تھی، ایک پُرکشش پیشکش کی جو قبول کر لی گئی۔ اس بعد ۱۹۵۰ء میں شروع ہونے والی انضمام کی سیلابی لہروں نے سب کچھ اتھل پتھل کر دیا اور ۱۹۶۳ء تک یہ سب برطانوی کمپنیاں ناردرن رشنل یونین گروپ میں ضم ہوکر یکجان ہوگئیں۔

چشتی صاحب اس کو اپنی خوش قسمتی گردانتے ہیں کہ اس وقت نیو جوبلی کے جنرل منیجر جناب ایس سی سجالی کو لاہور کے لیے ایک ں منیجر کی تلاش ہوئی اس لیے کہ اس عہدے پر فائز جناب محمد اسحٰق خان کو اس وقت کے نہایت فعال اور طاقتور کنٹرولر آف انشورنس آنجہانی ں کانٹریکٹر نے مسلم انشورنس کا ایڈمنسٹریٹر مقرر کر دیا تھا۔ تو جناب سجالی نے یہ عہدہ چشتی صاحب کو پیش کیا اور انھوں نے بخوشی قبول کرلیا۔ ۱۹ء میں ان کو کراچی طلب کیا گیا اور پورے مغربی پاکستان کے لیے منیجر بنا دیا گیا، جس عہدے پر ان کو بہت لطف آیا۔ ۱۹۶۸ء میں ینڈرڈ بینک نے اپنی انشورنس کمپنی قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ چشتی صاحب بینک کے مالکان کے خاندان کے بہت قریب تھے اور ان کو نئی کمپنی ۔ نیجنگ ڈائریکٹر کا عہدہ قبول کرنا پڑا۔ زندگی کے بیمے اور بڑے بینکوں کو قومی ملکیت میں لیے جانے کے بعد چشتی صاحب نے اسٹینڈرڈ رنس میں رہنا مشکل پایا اور انھوں نے استعفیٰ دے دیا۔ اپنی ملازمتوں کی دل چسپ اور رنگین تصویریں بناتے ہوئے چشتی صاحب نے

فرمایا، ''لہٰذا جناب سجالی کو میرے استعفے کی خبر ملی، انھوں نے فوراً مجھ سے رابطہ کیا اور میں نے ستمبر ۱۹۷۵ء میں دوبارہ نیو جوبلی میں شمولیت اختیار کر لی جو ۱۹۸۱ء تک چلی جب مجھے مسلم انشورنس میں جنرل منیجر بننے کی پیشکش ہوئی، جو میں نے قبول کر لی۔ ۱۹۸۷ء میں پرائم انشورنس کی باگ ڈور میرے ہاتھوں میں آ گئی جو اب ڈیلٹا انشورنس کے نام سے جانی جاتی ہے۔''

انشورنس کی صنعت کے لیے اور اس کو پاکستان کے عوام میں مقبول بنانے کے لیے چشتی صاحب ہمیشہ آگے آگے رہے ہیں۔ ا انھوں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا کہ پاکستان کی مقامی بیمے کی صنعت کو مزید ترقی کرنا چاہیے تا کہ یہ بین الاقوامی معیار پر پہنچ سکے۔ یہی وجہ تھی ک انھوں نے چار برس کے لیے پاکستان انشورنس انسٹی ٹیوٹ کا صدر بننا قبول کیا جس کے وہ بڑے پُر زور حامی رہے ہیں۔ اس دوران انھو نے انسٹی ٹیوٹ کے لیے مالی امداد کے لیے بہت دوڑ بھاگ کی تا کہ نا کافی تعلیمی سہولیات میں بہتری پیدا کی جا سکے۔ پھر یوں ہوا کہ تعلیم ک میدان میں جد و جہد کرنے والی اور دور رس نگاہیں رکھنے والی شخصیت کے حامل مسٹر جسٹس میاں محبوب احمد نیشنل انشورنس ریفارمز کمیشن ک چیئرمین بنا دیے گئے اور انھوں نے انشورنس انسٹی ٹیوٹ کو مالی امداد فراہم کرنے میں چشتی صاحب کی مدد کی۔

ایم اے چشتی، انتھک محنت کرنے والے اور تنقیدی ذہن کے مالک انسان ہیں۔ اور صنعت کے میدان میں ایسی غیر پیشہ ورا حرکتوں کے سخت مخالف جن سے بیمے کی صنعت کا وقار مجروح ہو اور اس کی اخلاقیات پر حرف آئے۔ اس لیے کہ بالخصوص یہ صنعت صرف کاروبار ہی نہیں بلکہ انسانیت کی خدمت بھی کرتی ہے اس لیے غیر پیشہ ورانہ کام کرنے والے عاملین کے سخت خلاف رہتے ہیں۔ اور ای شخصیتوں سے کبیدہ خاطر رہتے ہیں جو صرف اپنے ادارے کے مفاد کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں، ''میرا ضمیر مجھے کسی اور طرح کا کا کرنے پر ملامت کرتا ہے۔ ہماری صنعت کے بہت سے لوگ مجھ سے خفا رہتے ہیں اس لیے کہ میں صاف گو انسان ہوں۔ یہی وجہ ہے ک ہمیشہ میں لگی لپٹی کے بغیر اپنی بات کہتا رہتا ہوں، لکھتا ہوں اور اسی طرح لکھتا رہوں گا۔ تا کہ یہ صنعت عوام کے ذہنوں میں پھلتی پھولتی رہے اس کے گاہکوں کو صحیح قسم کے اشارات ملتے رہیں، اور حکومت کو معلوم ہو کہ یہاں بیمے کی ایسی صنعت ہے جو فعال بھی ہے اور اپنے فرائض بھ پورے کر رہی ہے۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ اس صنعت میں مجھ سے زیادہ بزرگ شخصیتیں بھی، صرف عمر ہی میں بزرگ نہیں، موجو ہیں جیسے جناب روشن علی بھیم جی، محمد چودھری، روسی ڈُباش، اے یو صدیقی، اور ایس سی سجالی۔ مگر یہ سب نہ اتنی مصیبت اُٹھاتے ہیں نہ ا کے پاس اتنا وقت ہوتا ہے کہ وہ عوام میں اور بیمے داروں میں، بیمے کی صنعت کو فروغ دینے اور اس کا وقار بڑھانے کے لیے کام کر رہیں۔ میں جانتا ہوں کہ ان میں سے کچھ نے ماضی میں اس نوع کے کام کیے ہیں۔''

ایم اے چشتی نے صنعت کی بڑی کمپنیوں کی سربراہی نہیں مگر یقیناً وہ اس کے سب سے طاقتور ترجمان رہے ہیں۔ انھوں نے ک بار زخموں کو کُریدا ہے اور ممکن ہے کہ کبھی ان کے خیالات حقیقت پسندانہ بھی نہ رہے ہوں، مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انھوں نے بیمے کی صنعت کی طرف عوام کی توجہ دلانے کے لیے بڑے مصائب جھیلے ہیں، جن سے اس صنعت کو ترقی کے مواقع نصیب ہوئے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں ک یہ صنعت ان کی مقروض ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس خیال سے اور لوگ بھی متفق ہوں گے۔

ایس سی سجالی

بیمے کی صنعت کی ان روایتی بلند قامت شخصیتوں میں سے، ایک 'ماموں' سجالی بھی ہیں جنھوں نے پچھلی صدی کے پانچویں عشر میں پاکستانی بیمے کی صنعت کو ایک منفرد انداز فراہم کیے ہیں۔ سجالی نے بمبئی کے ایک تاجر گھرانے میں آنکھ کھولی اور وہیں تعلیم بھی پائی اگست ۱۹۹۷ء میں ان سے ملاقات کے دوران انھوں نے بتایا کہ ان کے دادا ''برطانیہ کے خطاب یافتہ طبقۂ امرا میں سے ایک تھے، یعنی پہ مسلم Baronet تھے۔ ان دنوں وہ کئی ٹیکسٹائل ملوں کے مالک تھے مگر اُسی وقت تک ہمارے اچھے دن تھے۔ جب میری عمر صرف چودہ بر

ں تھی، ان کا سارا کاروبار تباہ ہوگیا اور قرض خواہوں کی ادائیگی کے لیے انھیں اپنے تمام اثاثے فروخت کرنے پڑے۔ ۱۹۴۵ء تک میں اپنی علیم ختم کر چکا تھا، میں نے 'Higher Maths' میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی اور برٹش انڈیا اینڈ جنرل انشورنس میں ملازمت کر لی تھی۔ مجھے چانک کالج سے نکال لیا گیا تھا۔ یہ بھی ایک دل چسپ قصہ ہے۔ میں اپنا ماسٹرز ختم کر چکا تھا اور بازاروں میں آوارہ گردی کر رہا تھا کہ اس کمپنی کے چیئرمین اور نہایت نفیس انسان جناب اسمتھ سے ملاقات ہوگئی، جو میرے والد کے ساتھ برج کھیلا کرتے تھے۔ اس طرح وہ مجھ سے واقف تھے۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں کالج سے نکلنے کے بعد کیا کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ میں نے کہا کہ میں نے ابھی کوئی فیصلہ ہیں کیا ہے اس لیے کہ میں نتیجے کا انتظار کر رہا ہوں۔ انھوں نے مجھے اپنی کار میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں یہ سمجھتے ہوئے بیٹھ گیا کہ وہ مجھ کو دوپہر کے کھانے کے لیے میرے گھر تک پہنچا دیں گے جو وہاں سے کچھ زیادہ دور نہیں تھا۔ بجائے گھر چھوڑنے کے وہ مجھے سیدھے اپنے دفتر لے گئے اور ایک بزرگ پارسی مسٹر دستور سے متعارف کرایا جو BIG کے جنرل منیجر تھے۔ مسٹر اسمتھ نے دستور صاحب سے کہا، 'آپ اپنے لیے ایک معاون ڈھونڈ رہے تھے، یہ رہے میرے دوست سجانی کے بیٹے، ان کو رکھ لیجیے۔ میں اس کو جانتا ہوں، اچھا لڑکا ہے، میں اس کے پ سے بھی واقف ہوں۔ بس اسی طرح میرے پیشے کی شروعات ہوئی، صرف اسی طرح۔''

یہ ۱۹۴۶ء کا واقعہ ہے۔ کمپنی نے پہلے میری تربیت بمبئی میں کی اور اس کے بعد مجھے زیرِ تربیت جونیئر آفیسر کی حیثیت سے دوسرے ہر کی ایک چھوٹی سی شاخ میں تعینات کر دیا۔ ایک دن اچانک مجھے جنرل منیجر کی جانب سے ایک ٹیلی گرام ملا، ۱۰ر اگست ۱۹۴۷ء کے آس س، جس میں مجھے فوراً بمبئی واپس پہنچنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ میں بمبئی پہنچا تو حکم ملا کہ میں سیدھے کراچی پہنچ جاؤں جہاں ہماری کمپنی کی یک شاخ کام کر رہی تھی اور مجھے اس کا انتظام سنبھالنے کے لیے کہا گیا، اس لیے کہ کراچی تین چار دنوں کے اندر پاکستان کا دارالحکومت بننے لا تھا۔''

''ہماری کمپنی کے چیئرمین کپاس کے بیوپاری تھے۔'' ماموں نے اپنی یادداشت کو کھنگالتے ہوئے بتایا،'' ان کے جننگ کے بہت سے کارخانے تھے۔ اور وہی لوگ، برٹش انڈیا اینڈ جنرل انشورنس کمپنی کی، جس کو BIG کہا جاتا تھا بنیاد رکھنے میں پیش پیش تھے۔ سندھ میں ھی ان کے کافی مفادات تھے اس لیے کہ وہ بنیادی طور پر کپاس کے بیوپاری تھے۔ سو یوں ہوا کہ وہ سارے ہندو لوگ جو جننگ کے کارخانے لاتے تھے، حتیٰ کہ وہ بھی جو اس کمپنی کے مقامی کرتا دھرتا بھی تھے اچانک بھاگ کھڑے ہوئے۔ وہ سب فسادات کی وجہ سے بھاگ گئے تھے ر یہی وجہ تھی کہ میں اچانک بھیجا گیا تھا اور اس طرح میں نئی مملکت، پاکستان، کے دارالحکومت کراچی میں تھا۔ یہ بڑا دل چسپ زمانہ تھا۔ رہنے ی جگہ ایک مسئلہ تھی۔ لہٰذا میں ایک خیمے میں قیام پذیر ہوا، بیچ لگژری ہوٹل کے بالکل سامنے، جو اس وقت تعمیر کے مراحل سے گزر رہا تھا۔ مجھے تنا یاد نہیں کہ کتنے دن میری اس طرح گزری تھی۔ مسٹر ہاورڈ اسٹیفرڈ ان دنوں انشورنس ایسوسی ایشن کے سیکریٹری تھے اور وہ ایچ اے مہتا کمپنی کے منیجر کے فلیٹ میں مقیم تھے۔ جب وہ چلے گئے تو رہنے کے لیے یہ فلیٹ مجھ کو مل گیا۔ وہ فلیٹ سولجر بازار میں تھا۔ یہ تھی میری ہجرت کی ستان۔ اس وقت بھی ہم بمبئی کے دفتر کے ماتحت کام کر رہے تھے۔ مگر پھر اچانک ایک نئے صاحب کلکتے سے آئے اور انھوں نے کمپنی کو non-tarn کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ فیصلہ میرے مزاج کا نہیں تھا اس لیے میں نے کوئی اور ملازمت کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہی وہ وقت تھا جب یری ملاقات امیر علی فینسی صاحب سے ہوئی۔ وہ بمبئی میں ہمارے پڑوسی تھے اور افریقا سے واپس آئے تھے۔ وہ ہز ہائینس آغا خان سے بہت ریب تھے اور انھوں نے مجھے بتایا کہ جلد ہی وہ 'نیو جوبلی' نام کی ایک نئی پاکستانی کمپنی کھولنے والے ہیں اور انھوں نے مجھے اس کی سربراہی کی ش کش کر دی۔ میں نے یہ پیش کش فوراً قبول کر لی اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں، میں بہت دنوں تک اس میں رہا۔''

ہاں! جب میری ان سے پہلی ملاقات ہوئی تھی وہ نیو جوبلی کے چیف ایگزیکیٹو تھے۔ وہ میری ہی عمر کے تھے، ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء ں نئی نئی بننے والی کمپنیوں کے نوجوان، تیز طرار اور ابھرتے ہوئے ایگزیکیٹو کی طرح۔ اور اکثریت کی طرح وہ بہت متحرک اور کام میں لطف

اٹھانے والے تھے، جو جدید اندازِ انتظام کے قائل تھے جس کا انھیں اس وقت تجربہ ہوا جب وہ اعلیٰ انتظامی تربیت کے لیے برطانیہ اور ہارورڈ، امریکا گئے تھے۔ اچھے دنوں کے بارے میں بات کرتے ہوئے ماموں اپنی یادوں کی وادیوں میں بھٹکتے رہے۔ جب بھٹو نے قومی ملکیت میں لینے والی عوامی تحریک شروع کی، دوسروں کی طرح ماموں بھی اس نتیجے پر پہنچے کہ ان جیسے لوگوں کے لیے اب کوئی مستقبل نہیں اور وہ بھی اس زمانے ۱۹۷۰ء (ساتویں عشرے) میں ملک سے باہر' قابلیت کے بہاؤ' کے ریلے میں بہہ کر دبئی جا پہنچے۔ وہاں انھوں نے کئی اہم ملازمتیں کیں اور جب ان کے بچے پڑھ لکھ کر دوسرے ملکوں میں مستقل قیام پذیر ہو چکے تو انھوں نے پاکستان واپس آنے کا فیصلہ کر لیا۔ اب وہ مسلم انشورنس کے چیف ایگزیکٹیو ہیں اور ان کے اپنے الفاظ میں happy to be back home۔

وہ گھر واپس آ کے خوش ہیں مگر یک گونہ اُداس ہو جاتے ہیں جب میں ان سے انشورنس میں کام کرنے کے موجودہ حالات کے بارے میں سوال کرتا ہوں جو اس وقت کے مقابلے میں بہت بدل چکے ہیں جب وہ پاکستان سے امارات چلے گئے تھے۔ ماموں کے الفاظ میں "اب مارکٹ بہت بدل چکی ہے، اس زمانے کے مقابلے میں جب ہم اور تم، چھٹے اور ساتویں عشرے میں، ایک ساتھ تھے۔ وولفرام، تمھیں تو یاد ہوگا نا، جب تم یہاں تھے تو ہم لوگ اکٹھے لنچ کیا کرتے تھے۔ تم، کبھی روشن علی بھیم جی کے ساتھ، حبیب کے لوگ وغیرہ اور میں۔ ہم سب گویا ایک کلب کے ممبر کی طرح تھے۔ اور کبھی دوستوں کی طرح۔ مگر آج اس طرح ہم، اعلیٰ سطح پر، بھلا کتنی بار ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ میں ایک اور مثال دوں گا جس کو سن کر تمھیں اندازہ ہو جائے گا کہ میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں۔ جب میں انشورنس ایسوسی ایشن کا چیئرمین تھا اور ہمیں وزارت کے افسروں سے ملاقات کے لیے جانا تھا، میں کے ایف حیدر کے پاس گیا اور ان سے ساتھ چلنے کے لیے کہا، اور وہ فوراً تیار ہو گئے۔ انھوں نے صرف اتنا کہا 'ہاں، ماموں ضرور چلوں گا مگر خیال رکھنا وہ جگہ نچلی منزل ہی میں ہو۔ وہ آسانی سے طرح دے سکتے تھے۔ میں ان کے مقابلے میں کم عمر تھا۔ اگر قومی معاملات ہوتے، وزارت یا پی آئی سی، وہ ہمیشہ ساتھ جاتے۔ انھوں نے یا مسٹر ایوان نے کبھی معاملات کو صرف ای ایف یو کے پہلو سے نہیں دیکھا تھا۔ انھوں نے ہمیشہ وسعتِ نظر سے دیکھا تھا۔ اور وہی طریقہ، بلکہ اس بھی زیادہ قوت والا انداز روشن علی بھیم جی نے اپنایا جب وہ ای ایف یو میں شامل ہوئے تھے۔ وہ اس صنعت کی بڑی توانا آواز بن کر ابھرے تھے۔ ہم لوگوں کا انداز متعصبانہ کبھی نہیں رہا تھا، اور ہم نے ہمیشہ پاکستانی کمپنیوں کو سہارا دینے کے بارے میں سوچا تا کہ مارکٹ کے ڈھانچے کے اندر رہتے ہوئے ان کو استحکام ملے، تم بھی تو اس میں شریک رہتے تھے۔ اس دور میں حکومت بھی ہمیں سہارا فراہم کرتی تھی۔ تمھیں تو یاد ہوگا غلام فاروق کا زمانہ، اور کس طرح آدمجی انشورنس کمپنی شروع ہوئی تھی؟ میں تمھیں یاد دلاتا ہوں۔ ہم سب، انشورنس کے افسران اور کچھ سربرآوردہ صنعتکار، غلام فاروق کے دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ غلام فاروق اس وقت ایوب خان کے ماتحت وزیرِ تجارت تھے۔ اور آدمجی خاندان سے ان کے قریبی مراسم تھے۔ سو، انھوں نے دونوں آدمجی برادران سے کہا، جہاں تک میری معلومات ہیں آپ لوگ اپنا سارا بزنس 'رائل ایکس چینج' کو دیتے ہیں۔ آدمجی برادران نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا، وہ یہ تو پچھلے چالیس پچاس برسوں سے کر رہے ہیں، تو اچانک ہم اس کو کیسے بدل سکتے ہیں؟ مگر فاروق نے جواب دیا کہ وہ کوئی عذر قبول کرنے کے لیے تیار نہیں اور کہا، یا تو آپ لوگ اپنی کمپنی بنائیں یا پھر اپنا سارا بزنس کسی پاکستانی کمپنی کو دیں۔ اگر آپ نے یہ نہیں کیا تو میں آپ کے ادا کیے ہوئے پریمیم پر ٹیکس کی چھوٹ دینے کی اجازت نہیں دوں گا۔ آپ اس کو جمہوری طریقہ نہیں کہہ سکتے مگر حقیقتاً اسی طرح آدمجی انشورنس کمپنی وجود میں آئی تھی۔ اور یہی کچھ طریقہ داؤد خاندان کے ساتھ ہوا اور ان کی سنٹرل انشورنس کمپنی وجود میں آئی۔ اسی طرح کام ہوتے تھے اور لوگوں کو آگے کی طرف ڈھکیلا جاتا تھا۔ حکومت کا اندازِ نظر ہی بالکل مختلف تھا۔ ہمارے ہاں آج بھی اچھے قسم کے سرکاری افسران ہیں اس کے باوجود وہ کتنے مختلف ہیں ان عظیم سرکاری افسروں سے جیسے کہ، ایس ایم یوسف، عباس خلیلی، عثمان علی، سعید احمد وغیرہ تھے۔ وہ لوگ حد درجہ ایمان دار اور محنت کرنے والے لوگ تھے، جرأت مند، اور ہمیشہ قوم کی بھلائی پر کمربستہ۔ ہم سب ایک ہی کشتی کے سوار اور ایک ہی جانب کھینے والے لوگ تھے۔ کنٹرولر آف انشورنس، اسٹیٹ بینک۔ ایک اتصال

تھا حکومتی اور نجی اداروں کا جس نے مل کر ہماری صنعت کو اس مقام تک پہنچایا تھا جو ۱۹۷۲ء میں موجود تھا۔ ۱۹۵۱ء اور ۱۹۷۲ء کا درمیانی زمانہ سب سے زیادہ پیداواری برسوں پر مشتمل تھا، جس کو ہم پاکستان کا 'سنہرا دور' کہہ سکتے ہیں، اور اس میں کوئی کلام نہیں۔ ابھی میں نے کچھ اعلیٰ سرکاری افسروں کے نام گنوائے ہیں۔ میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ آج کے دور کی انتظامیہ میں اس قابلیت کے افسر نہیں۔ مگر دراصل پورا معاشرہ تبدیل ہو چکا ہے۔ پانچویں اور چھٹے عشرے میں لوگ صحیح معنوں میں اپنے ملک وقوم کی خدمت کرنے پر تیار رہتے تھے۔ ہم سب ایک مقصد کے لیے کام کرتے تھے، اور اسی لیے تو ہم لوگ یہاں آئے تھے۔ اب وہ 'ہم سب اکٹھے کر سکتے ہیں' والا جذبہ کہیں کھو گیا ہے۔ اور میں اس کا سارا الزام سرکاری افسروں پر نہیں دھر رہا ہوں، ہم سب ذمے دار ہیں، ہمارا معاشرہ تلپٹ ہو چکا ہے۔ میں نے ابھی ایس ایم یوسف کا ذکر کیا تھا۔ کتنی بار امیر علی فینسی نے انھیں ان کے گروہ میں شمولیت اختیار کرنے کی پیش کش کی تھی۔ انھوں نے ہمیشہ کی طرح انکار کیا۔ جواب میں انھوں نے کہا تھا، 'دیکھیے، اگر میں نجی حلقے میں کام کرنا چاہتا تو بہت پہلے کر چکا ہوتا، میں حکومتی حلقے میں شامل ہی نہ ہوتا۔ بس مجھے اس میں کوئی دل چسپی نہیں، ہم ایک دوسرے کے دوست ہیں، برج کے اچھے ساتھی ہیں، مگر بس مجھے آپ کی پیش کش میں کوئی دل چسپی نہیں' اور واقعی انھیں ایسی پیش کش میں کوئی دل چسپی نہیں تھی اس لیے کہ انھیں اپنی ملازمت پر فخر تھا کہ وہ ایک اعلیٰ اور طاقتور عہدے پر فائز ہیں اور یہ بھی کہ اس پر رہتے ہوئے وہ جو کچھ بھی کریں گے وہ اس نئی مملکت کے باشندوں کی خدمت کے لیے ہوگا۔''

''مگر جیسا کہ میں نے پہلے کہا تھا، میں پاکستان واپس آنے پر بہت مسرور ہوں۔ دبئی کی ملازمت بہت اچھی تھی اور اچھا مشاہرہ ملتا تھا۔ مگر وہاں مستقل قیام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اس لیے کہ وہ اس بات کی اجازت نہیں دیتے۔ سونیا اور میں چاہتے تو اپنے بچوں کے ساتھ انگلستان یا امریکا جا کر رہ سکتے تھے مگر اس عمر میں انسان کا ایک اپنا طریقۂ زندگی ہو جاتا ہے، اور ہم حالات کے مطابق اپنا اندازِ زندگی تبدیل کر لیتے ہیں۔ اور سچ پوچھو تو لندن میں مجھ پر بیزاری کا غلبہ ہو جاتا ہے، دبئی میں تو اور بھی زیادہ اس لیے کہ وہاں کچھ کرنے کے لیے نہیں ہوتا۔ دراصل میں ایسے ماحول کے لیے ناموضوں انسان ہوں۔ آپ کہیں بھی جا کر رہیں، آپ دوسرے درجے کے شہری گردانے جاتے ہیں، ہمیں یہ قبول کرنا پڑتا ہے، خواہ آپ کے اچھے دوست اس کے برخلاف کچھ بھی کہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے دبئی کو خیرباد کہہ دیا اور واپس یہاں آ گیا۔ ٹھیک ہے، آپ وہاں بہت کما سکتے ہیں، مالی پہلو سے وہ اعلیٰ درجے کی جگہ ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کے بدلے میں آپ اپنی عزتِ نفس کھو دیتے ہیں۔ چاہے آپ کتنے بڑے عہدے پر ہوں اور بہت بڑی تنخواہ پاتے ہوں، ایک غیر ملکی کی حیثیت میں آپ دوسرے درجے کے شہری اور ملازم ہی کہلائیں گے۔ بس اتنی ہی آپ کی اوقات ہے۔ اسی وجہ سے میں وہاں سے چلا آیا۔ اور یہاں آ کر میں 'میں' ہو گیا ہوں، ایک اوّل درجے کا شہری، اور ملک کے لیے اپنی خدمات پیش کرنے کے لیے تیار۔''

بگڑا بیٹا گھر واپس آ گیا ہے؟ یہ ایک بہت حساس اور الجھے ہوئے مسئلے کا آسان ترین بیان ہو سکتا۔ ایسی بہت سی مثالیں ہیں کہ بہت سے کامیاب ترین تجار، صنعتکار اور ماہرین اس وقت ملک چھوڑ کر چلے گئے جب سیاست نے ان کے گلے دبانے شروع کر دیے تھے۔ ان میں سے بہت تو جس ملک میں ہیں ملازمت سے فراغت کی عمر کو پہنچ گئے ہیں اور ان کو اسی نوع کے مسائل در پیش ہیں جیسے کہ ماموں سجالی نے بیان کیے ہیں۔ اور میں یہاں ان کی واپسی پر بہت مسرور ہوں، جہاں کبھی ہم چالیس برس قبل پہلی بار ملے تھے۔ اور جیسا کہ انھوں نے کہا ہے، ہم سب ایک کلب کے ممبر جیسے تھے، ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے، اور کچھ تو بہت اچھے دوست بن گئے تھے۔ ہمارے پیشہ ورانہ تعلقات زیادہ ترنیشنل کو انشورنس اسکیم کی وجہ سے استوار ہوئے تھے اس لیے کہ ای ایف یو اس کی لیڈر تھی۔ آدمجی اور سینٹرل کی ابتدا سے قبل نیو جوبلی، پریمیئر، حبیب اس کے دوسرے اہم ارکان تھے۔ میں اور ماموں سجالی ایک بہت بڑے، بلکہ اس وقت تک شاید سب سے بڑے، کلیم کی وجہ سے بہت قریب آ گئے تھے۔ وہ مشہورِ زمانہ 'ستلج ریور کراسنگ' کلیم تھا۔ سوئی گیس کی پائپ لائن سیلاب کی وجہ سے بہہ گئی تھی۔ یہ PIDC کا ایک منصوبہ تھا اور PIDC کے چیئرمین جنرل افتخار احمد اس وقت شدید غصے میں آ گئے تھے جب ان کے انشورنس افسر

نے ان کو بتایا کہ انشورنس کے پینل کے ارکان کو شبہ ہے کہ شاید پالیسی کی شرائط کے مطابق یہ کلیم پورا ادا نہ ہو سکے۔ انھوں نے اہم کمپنیوں کو اپنے دفتر میں طلب کیا، میں، سجالی اور دُباش نے اس ملاقات میں شرکت کی تھی۔ میں جو عمر میں ان سب سے کم تھا ان سب کا اس لیے ترجمان تھا کہ ای ایف یو کا اس میں سب سے بڑا حصہ تھا۔ انھوں نے بہت خوش گوار طریقے سے ہم سب کو خوش آمدید کہا، بلکہ زیادہ ہی مہربانی فرمائی۔ مگر ان کا رویہ اچانک درشت ہو گیا جب بہت ہی شرکت سے مگر اعتماد کے ساتھ ہم نے ان کو بتایا کہ یہ کلیم جس انداز میں پیش کیا گیا ہے شاید پورا ادا نہ ہو سکے گا۔ وہ اچانک بھڑک اُٹھے اور بلند آواز میں اپنے انشورنس آفیسر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، ''مسٹر احمد'' یہ ان کے انشورنس افسر کا نام تھا اور مجھے ایسا لگا گویا احمد صاحب کا قد سکڑ کر چھوٹا ہو گیا ہو، ''مسٹر احمد، ان حضرات کو بتا دیجیے کہ میرا حکم ہے کہ کل تک یہ پورا کلیم ادا ہو جانا چاہیے'' یہ کہنے کے بعد انھوں میری طرف گھور کر دیکھا۔ میرے ساتھیوں نے بھی میری طرف نظر کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب فیلڈ مارشل ایوب خان اور ان کی فوج ہی اس ملک میں اہمیت رکھتی تھی اور فیصلے کرتی تھی۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ پاکستان میں میرے انشورنس کے پیشے کا یہ سب سے نازک وقت ہے اور مجھ سے زیادہ میرے ساتھی جنرل صاحب کے غیظ کا شکار ہیں۔ میں ایک لمحے کے لیے رُکا اور پھر آہستہ سے کہنا شروع کیا، ''جنابِ والا، تمام تر احترام کے ساتھ میں آپ سے اختلاف کی جرأت کرتا ہوں۔ بین الاقوامی انشورنس میں میری طویل اور شدید محنت پر مشتمل تربیت کے دوران میرے کسی بھی لائق استاد، جن کا میں شاگرد رہا ہوں، مجھے کبھی یہ نہیں پڑھایا کہ بین الاقوامی انشورنس والے کسی فوجی یونٹ کا حصہ ہوتے ہیں، میرے خیال میں دنیا میں کہیں بھی نہیں۔ ہم صرف اپنی پالیسی کی شرائط کا حکم مانتے ہیں یا پھر کسی عدالت کا، اگر ضروری ہو تو۔'' میرے ساتھی سب زرد پڑ گئے اور انھوں نے سمجھا ہو گا کہ بس اب وقت آ گیا ہے۔ مگر ہم سب کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اچانک جنرل نے زوردار قہقہہ لگانا شروع کیا اور چائے وغیرہ لانے کا حکم دیا۔ اس کے بعد دوستانہ ماحول میں کچھ باتیں ہوئیں اور یہ طے پایا کہ میں اور ماموں سجالی Topling & Harding سے، جو اس زمانے میں بہت بڑے انشورنس سرویئر تھے، بات چیت کے لیے لندن جائیں گے اور ان سے ایک غیر جانب دارانہ سروے کا انتظام کریں گے تاکہ بلا کسی تاخیر کے کلیم ادا ہو سکے۔ ماموں اور میں ایک ساتھ لندن گئے۔ جنوری فروری کے مہینے تھے، شدید سردی کا موسم تھا اور یہیں سے ہماری طویل دوستی شروع ہوئی تھی۔

ان جیسے ہی لوگ تھے میں جن کے لیے پسندیدگی کے جذبات رکھتا ہوں اس لیے کہ ان ہی کے ذریعے مجھے اندازہ ہوا کہ ان کے نزدیک پاکستان کتنی اہمیت رکھتا ہے۔

ان کے بوئے ہوئے بیج اُگ رہے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ بالآخر یہ ملک کامیاب ہو گا۔

اعجاز اللہ صدیقی

اعجاز اللہ صدیقی بھی ایس سی سجالی، محمد چودھری، چشتی اور دُباش کی عمر کے ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے پاکستان میں بیمے کی صنعت کی تاریخ کے صفحات پر اپنے نشان ثبت کیے ہیں۔ ایک نہایت مختلف کردار کے انسان، اگر ان کا تقابل بیمے کی صنعت کے دوسرے پہل کاروں سے کیا جائے۔ انھوں نے پریمیئر کے چیف جنرل منیجر کے عہدے سے سبکدوش ہونے کے چند ماہ بعد، نومبر ۱۹۹۸ء میں از راہِ مہربانی قمر ہاؤس (حال ای ایف یو ہاؤس) میں خود آ کر مجھ سے ملاقات کی اور لوگوں کی طرح ان سے میرے قریبی تعلقات رہے ہیں۔ پچھلے تیس برسوں میں جب بھی میں پاکستان آتا محمدی ہاؤس میں ان سے ملاقات کے لیے ضرور جاتا۔ وہ بھی جب میونخ آتے، سال میں کئی بار، مجھ سے ملنے ضرور آتے۔ ان سے عام موضوعات پر اور بیمے کی صنعت کے مسائل پر بات چیت میں لطف آتا اس لیے کہ نہ صرف یہ کہ وہ ایک باخبر انسان ہیں بلکہ وہ ایک اچھے اور متوازن تنقید کرنے والے دماغ کے حامل بھی ہیں، آزاد خیال بھی جو اکثر طے شدہ نظریات سے ہٹ کر سوچتے بھی ہیں۔

وہ یو پی، ہندوستان کے شہر الہ آباد میں ۱۹۲۵ء میں پیدا ہوئے، ان کے والد مقامی سطح پر ایک مشہور وکیل تھے۔ الہ آباد میں ان کی تعلیم ہوئی اور انھوں نے ۱۹۴٦ء میں قانون کی ڈگری حاصل کی۔ جب میں نے صدیقی صاحب سے اپنی زندگی کے سب سے اہم حصے کے بارے میں دریافت کرنا چاہا تو انھوں نے کہا، ''وہ ایک خالص سیاسی کیفیت تھی جس کے زیرِ اثر میں نے پاکستان ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں ۱۷ اپریل ۱۹۴۸ء کو پاکستان پہنچا۔ اس کے لیے میں بمبئی گیا اور وہاں سے جہاز کے ذریعے سفر کیا تھا۔ یہاں میرا جاننے والا کوئی نہ تھا، بس چند دوست تھے۔ میں نے اپنے ایک دوست کے ہمراہ سفر کیا تھا، ایک سوٹ کیس ساتھ تھا، اس کے علاوہ کوئی اور سامان نہیں، بس کچھ رقم جیب میں تھی۔ یہاں پہنچ کر مجھے بنیادی فیصلہ کرنا تھا کہ میں وکالت شروع کروں یا کچھ اور۔ میں نے اپنے والد کو ایک کامیاب اور مشہور وکیل کی حیثیت میں دن رات کام کرتے دیکھا تھا۔ نہ ان کے پاس خود اپنے لیے وقت تھا اور نہ میرے لیے۔ لہٰذا میں نے اس کے برعکس کچھ اور کرنے کا فیصلہ کیا اور یہ طے کیا کہ میں بیمے کے کاروبار کو اپنا پیشہ بناؤں گا۔ اس مرحلے تک پہنچنے میں کافی طویل عرصہ لگا۔ اس وقت بہت سی ملازمتیں مل رہی تھیں مگر مجھے کوئی خاص جلدی نہ تھی اس لیے کہ میری جیب میں اپنے والد کی طرف سے دی ہوئی کافی رقم موجود تھی۔ مگر ایک دن عجیب اور مضحکہ خیز بات ہوئی۔ میرا ایک دوست جس کے ساتھ میں کارڈ کھیلا کرتا تھا اسکاٹش یونین انشورنس میں ملازمت کرتا تھا۔ ایک شام اس نے اچانک مجھ سے کہا، ''صدیقی صاحب، آپ کچھ کرتے کیوں نہیں۔ آخر آپ کوئی فیصلہ کیوں نہیں کرتے۔ میری دوستی کی خاطر ہی سہی آپ چل کر میرے باس سے ملیے تو سہی۔ بس میں نے دوستی کی خاطر وہی کیا۔ ان کے باس Mr Edward John Ashley Plumbe سے ملاقات ہوئی۔ وہ ایک نفیس دوستانہ شخصیت کے مالک تھے، شاید ان چند بہترین لوگوں میں سے تھے جن سے اپنے پیشے کے دوران میری ملاقات رہی ہے۔ وہ مجھے پسند آئے اور میں نے ان کے ہاں ملازمت کرنا قبول کرلیا۔ مسٹر پلمب نے مجھے اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا۔ وہ جب بھی معائنے کے لیے کہیں جاتے مجھے ساتھ لے جاتے۔ اگرچہ وہ بنیادی طور پر مارکٹنگ کے آدمی تھے، اور ایک لاجواب آدمی، مگر ان کو بیمے کے کاروبار کے تکنیکی معاملات کا بھی اچھا ادراک تھا۔ مجھے یہ سب کچھ بڑا دل چسپ لگا۔ وہ بہت زبردست انسان تھے۔ مگر ایک برس بعد ہی ان کا تبادلہ کلکتے ہوگیا۔ ان کی ترقی ہوگئی اور وہ کمپنی کے دوسرے سب سے بڑے افسر بن گئے جس کو پورے مشرق کی ذمے داری سونپ دی گئی۔ نارچ یونین میں انضمام کے بعد ان کو لندن بلا لیا گیا اور وہ گروپ کے چیف انڈر رائٹر کے عہدے پر فائض ہو گئے۔ مگر میں بہت خوش قسمت تھا کہ ان کی جگہ پر تعینات ہونے والے Mr Tom Climie بھی بیمے کے ایک قابل انسان تھے۔ اور میں نے ان کے ساتھ دس بارہ برس تک کام کیا۔''

میں Mr Climie سے واقف رہا ہوں۔ ایک خاص اسکاٹ قسم کے آدمی تھے، جن (کی زبان) کو پہلی ملاقات پر سمجھنا ذرا مشکل ہوتا تھا۔ وہ کافی سخت انسان لگتے تھے مگر ذرا قریب سے دیکھیں تو وہ ایک ناتراشیدہ ہیرے کے مماثل تھے۔ وہ بیمے کے تکنیکی معاملات میں بڑی مہارت رکھتے تھے اور انھوں نے انشورنس ایسوسی ایشن کی فائر ٹیکنیکل کمیٹی کے معیار کو بلند رکھنے میں بڑا کام کیا تھا۔ جب پریمیئر انشورنس کمپنی کی بنیاد رکھی گئی تو وہ اس کے چیف منیجر بنے اور تین برس تک انھوں نے اس کمپنی میں قیام کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ پاکستان کے لیے نارچ یونین گروپ کے منیجر بھی رہے۔ دفتر کا آدھا وقت وہ اپنی 'مادر کمپنی' میں گزارتے اور باقی آدھا پریمیئر میں۔

میں نے صدیقی صاحب سے پوچھا کہ جب وہ برطانوی کمپنی میں ملازم تھے، کیا وہ پاکستانی کمپنی میں کام کرنا پسند کرتے۔ انھوں نے بالکل کسی تامل کے بغیر جواب دیا، ''نہیں، نہیں، بالکل نہیں۔ میں انسان پر یقین رکھتا ہوں اس کی قومیت پر نہیں۔ میں قومیاتی نظریات پر یقین ہی نہیں رکھتا، نہ تعصبات پر۔ مجھے برطانوی کمپنی میں کام کرنا اچھا لگتا تھا۔ مجھے کبھی اس بات کا گمان بھی نہیں ہوا کہ اس میں کوئی قباحت تھی۔ میں ایسے نظریات پر یقین نہیں رکھتا۔ اس کے برعکس میرے دل میں مسٹر پلمب اور مسٹر کلائی می کے لیے تشکر کے گہرے جذبات ہیں۔ میں نے ان دونوں حضرات سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ دونوں ہی اپنے اپنے مقام پر بیمے کے بڑے عظیم لوگ تھے۔''

صدیقی نے اپنی کمپنی میں جونیئر افسر کی حیثیت سے کام شروع کیا تھا۔ ۱۹۵۲ء میں عدالتِ عالیہ نے فیصلہ کیا کہ پنجاب کاٹن پول توڑ دیا جائے۔ نتیجے کے طور پر اُن کئی کمپنیوں نے لاہور میں اپنی شاخیں کھولنی شروع کر دیں جن کے نمائندے وہاں پہلے سے موجود نہ تھے۔ صدیقی صاحب نے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے کہا کہ ''میری اپنی کمپنی نے کچھ اشتہارات دیے، کچھ لوگوں کے انٹرویو بھی ہوئے مگر بالآخر 'قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند'۔ مجھے لاہور جانے کے لیے چُن لیا گیا، پنجاب کے بیچوں بیچ، جو مجھے اچھا نہیں لگا۔ میں نے مسٹر کلائی می سے کہا کہ جہاں تک مجھے معلوم ہے پنجاب کے لوگ مہذب نہیں ہیں۔ اور پھر میں نے لاہور جانے سے انکار کر دیا۔ مسٹر کلائی می نے اصرار کیا اور کہا کہ 'بہتر ہے کہ تم جاؤ اور اپنے ساتھ تہذیب بھی لیتے جاؤ'۔ مجھے مجبوراً جانے پر راضی ہونا پڑا اس لیے کہ مجھ سے کہہ دیا گیا تھا کہ اگر میں لاہور نہیں گیا تو میرا تبادلہ بمبئی کر دیا جائے گا۔ اور پھر مجھے سارے اختیارات کے ساتھ لاہور روانہ کر دیا گیا، اس وعدے کے ساتھ کہ وہاں مجھے صرف تین برس رہنا ہوگا۔ میں جولائی ۱۹۵۲ء میں لاہور پہنچا اور مجھے جلد ہی اندازہ ہوگیا کہ یہ تو بڑے مزے کی نوکری تھی۔ مزے کی اس لیے اور بھی کہ مجھے کار دی گئی، ایک ڈرائیور، کلب کی سہولتیں اور میرے اور میرے اہلِ خاندان کے لیے طبی سہولتیں۔ وہ سب کچھ جو زندگی کو آسان اور دل چسپ بنانے میں مدد دیتا ہے۔ جب تین برس بعد کراچی واپس آنے کے لیے مجھ سے پوچھا گیا تو میں صرف اتنا کہا 'جی نہیں، شکریہ، بس مجھے لاہور ہی میں رہنے دیجیے'۔''

اور پھر صدیقی صاحب ۱۹۶۲ء تک لاہور ہی میں رہے۔ اس دوران 'اسکاٹش یونین' کو 'نارچ یونین' نے خرید لیا اور ان کی خدمات ان کے حوالے کر دی گئیں۔ صدیقی صاحب نے کہا، 'میں اس انضمام سے خوش نہیں تھا، میرے ذاتی مددگار، میرے چپراسی وغیرہ سب کو فارغ کر دیا گیا تھا۔ مجھے اس کا بہت افسوس تھا مگر میں کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ اور پھر جوں ہی پریمیئر انشورنس کمپنی نے مجھے ملازمت کی پیش کش کی، میں نے قبول کر لی۔ مگر صرف اس شرط کے ساتھ کہ میں کراچی واپس جانا نہیں چاہتا۔ میں ان 'غیر مہذب' پنجابیوں سے اتنا پیار کرنے لگا تھا کہ میں انھیں چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ انھوں نے میری شرط قبول کر لی۔ مجھے پریمیئر کا لاہور میں زونل منیجر بنا دیا گیا۔ مگر بالآخر مجھے کمپنی والوں کی حجت قبول کرنی پڑی اور ۱۹۶۹ء میں 'اٹارنی' کی حیثیت سے کراچی واپس جانا پڑا۔ اس وقت محمد چودھری 'سکریٹری' تھے۔ اختر آزاد ہم سب میں سینئر تھے، اس لیے وہی منیجر، بلکہ شاید ڈپٹی جنرل منیجر رہے ہوں، میں اب پورے یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ جب انھوں نے استعفیٰ دیا تو میں اور محمد چودھری دونوں جنرل منیجر بنا دیے گئے۔ یہ اگرچہ مضحکہ خیز صورتِ حال تھی مگر اس نے کام کیا۔ ہم دونوں کی جوڑی کامیاب رہی اور ہم دونوں اچھے دوستوں کی طرح رہے، بلکہ درحقیقت ہم دونوں اچھے دوست بن بھی گئے تھے، اچھے ساتھی بھی۔ پھر ایک دن انہوں نے مجھ سے کہا کہ انھوں نے آدمجی انشورنس کمپنی میں شمولیت کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں نے انھیں اس فیصلے سے باز رکھنے کی بہت کوشش کی۔ ان سے دوستانہ ماحول میں گفتگو رہی، کافی طویل وقت تک، مگر ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اور پھر وہ ہمیں چھوڑ کر آدمجی میں چلے ہی گئے۔''

میں صدیقی صاحب کو ایک طویل عرصے سے جانتا ہوں اور کئی بار میں نے ان سے پوچھنا چاہا کہ آپ اور محمد چودھری کی (قدیم روما جیسی) 'دونفری حکومت'، جس میں دونوں مشترکہ اختیارات رکھتے تھے، بھلا کس طرح چل سکی ہوگی اس لیے کہ ہم سب بیمے والوں کے لیے یہ ایک عجیب صورت تھی اور ہمیں اس کے بارے میں شبہات بھی تھے۔ اور اب بغیر پوچھے ہی انھوں نے اس نا پرسیدہ سوال کا جواب از خود دے دیا۔ ''ہم دونوں میں اچھی نبھی، بس ہم اچھے دوستوں کی طرح کام کرتے رہے۔'' اور جس طرح انھوں نے یہ الفاظ ادا کیے مجھے پورا یقین ہوگیا کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ سچ ہی ہوگا۔

چودھری کے چلے جانے کے بعد صدیقی صاحب من حیث الکل پریمیئر کے جنرل منیجر رہے، بلکہ ان کو چیف جنرل منیجر بھی بنا دیا گیا تھا، جس عہدے پر وہ ۱۹۹۸ء تک فائز رہے، جب عمر کے لحاظ سے انھیں ملازمت سے فراغت نصیب ہوئی۔ اب وہ پریمیئر سے 'مشیر' کے طور پر منسلک ہیں۔

ایک انسان جو پاکستان میں بیمے کی صنعت سے آدھی صدی تک منسلک رہا ہو، اس سے بات کرتے ہوئے مجھے بہت لطف آرہا تھا۔ ایک زمانے میں وہ اپنی طنزنوائی، بلکہ ترش روئی اور چبھتے ہوئے تبصروں کے لیے مشہور تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ کچھ دھیمے مزاج کے ہو گئے ہیں۔ وہ آج بھی بڑے بذلہ سنج انسان ہیں جو لوگوں پر جملے کسنے سے باز نہیں آتے مگر ان کے رازدارنہ مشاہدے سے ان کے مخلصانہ مزاج کا اندازہ ہو جاتا ہے، بہت پختہ کار، بہت پُرسکون اور خوش باش انسان۔ بیمے کی معروف شخصیتوں کے لیے وہ بہت اچھے اور خوش گمان خیالات رکھتے ہیں۔ صدیقی صاحب کے مطابق ''محمد چودھری آج بھی قریبی دوست ہیں، بڑے اچھے اور ذاتی دوست۔ مارکٹ میں شاید کسی کو یہ بات نہیں معلوم۔ میں یہ راز آپ پر اس لیے آشکار کر رہا ہوں کہ ایک طرح سے آپ کشتی کے پُرانے ملاّحوں میں سے ایک ہیں، اسی دور کے جب بیمے کی صنعت نے بہترین لوگ پیدا کیے تھے۔''

روسی دُباش، صدیقی کے الفاظ کے مطابق 'ایک روایتی شخصیت ہیں، مجھے نہیں معلوم کیوں مگر بیمے کے وسیع علم کے حوالے سے وہ بازار میں پہچانے جاتے تھے۔ وہ مثبت معنوں میں ایک ماہرِفن افسر تھے۔ اور ماموں سجالی؟ وہ عجب کردار تھا۔ اس نے بیمے کی صنعت کو گہوارے کی عمر میں بہت کچھ دیا تھا۔ ہمیشہ مدد کے لیے تیار۔ اچھے 'ٹیم ورکر'۔ روشن علی بھیم جی؟ اس سنہرے دور میں وہ بہت بڑے قد کے انسان تھے۔ ہر شخص ان کی عزت کرتا تھا، اور میں بھی ان لوگوں میں شامل تھا۔

''ہماری صنعت میں کچھ بڑی مضحکہ خیز شخصیتیں بھی تھیں۔'' ہم دونوں کچھ دیر کے لیے خاموش رہے اور یہ سوچتے رہے کہ ہم ایک دوسرے سے کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔ پھر صدیقی بولے، '' آپ کے پیارے دوست معین الدین، وہ ایک بڑے کامیاب انڈر رائٹر تھے۔ وہ موسم کو دیکھ کر انڈر رائٹنگ کے فیصلے کرتے تھے۔ تھا نا مضحکہ خیز؟ آپ نے دیکھا کہ اس زمانے میں ہماری صنعت میں کیسے کیسے کردار موجود تھے۔ وہ مضحک تھے مگر اکثر وہ بیشتر کامیاب بھی رہتے۔ میں یہ بات مثبت انداز میں کہنے کی کوشش کر رہا ہوں اور واقعتاً میرا مطلب بالکل صاف ہے۔ ان جیسے لوگ 'شوربے میں نمک' کے مماثل تھے اور چند مضحکہ خیزیوں کے باوجود انھوں نے ہمارے ملک کی بیمے کی صنعت کی ترقی میں نمایاں کام کیے تھے۔ اور میرے خیال میں جناب معین الدین ویسے ہی کردار تھے۔ انھوں نے اپنے ادارے کے لیے بہت کچھ کیا تھا اور اس طرح مارکٹ کے لیے بھی۔''

میں مصنوعی ہنسی ہنسے بغیر نہ رہ سکا، اور وہ بھی فراخ دلی سے مسکرا دیے۔ تب مجھے احساس ہوا کہ انھیں بھی اس بات کا اندازہ ہو گیا ہے کہ میں اچھی طرح سمجھ رہا ہوں کہ درحقیقت وہ کیا پیش کرنا چاہ رہے ہیں، اپنے آپ کو اس طرح، باکمال اور رازدارانہ انداز میں پیش کرنا کہ دیکھنے والا سمجھے کہ وہ کسی اور کا تذکرہ کر رہے ہیں، جو اتفاق سے ان سے ملتا جلتا ہے، جسمانی معنوں میں نہیں، بلکہ شاید اندازِ کار میں جو ہماری جسمانی زندگی کا ایک الجھا ہوا پہلو بھی ہے۔

روسی دُباش

روسی دُباش، جنھیں اعجاز اللہ صدیقی بیمے کی صنعت کی تاریخ کی ایک روایتی شخصیت کہتے ہیں، ان 'تین سواروں' میں سے ہیں فوراً جن کی طرف میرا ذہن منعطف ہو گیا جب بھی میں نے کتاب کے موضوع پر سوچنا چاہا۔ وہ ہم لوگوں میں سب سے سینئر تھے، جن کو صدیقی صاحب 'ہمارے ملاّح' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

وہ ۱۹۱۹ء میں بمبئی کے ایک ڈاکٹر کے گھر پیدا ہوئے اور ان کی پہلی ملازمت حبیب بینک میں، جو انھی دنوں قائم ہوا تھا، اسی شہر سے شروع ہوئی جہاں ان کی ولادت ہوئی تھی۔ اور وہ بینک ہی میں اس وقت تک کام کرتے رہے جب انھوں نے پاکستان ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا اس لیے کہ پورا حبیب گروپ نئی وجود میں آنے والی مملکت میں منتقل ہو گیا تھا۔ یہ اکتوبر ۱۹۴۸ء کا واقعہ ہے۔ تمام ڈائریکٹر، ان کے

اہلِ خاندان اور ان سے منسلک سارے ادارے ایک ساتھ منتقل ہو گئے تھے۔

پاکستان کی پچاسویں سالگرہ کے ایک دن بعد، یعنی ۱۵ر اگست ۱۹۹۷ء کو جب ہم اپنے ہوٹل کے کمرے میں انٹرویو کے لیے بیٹھے ہوئے تھے تو میں نے روسی ڈُباش سے سوال کیا تھا کہ کیا وہ حبیب خاندان کے رشتے دار ہیں اس لیے کہ پچھلے چالیس برسوں میں جب بھی ہماری ملاقات ہوئی ہے حبیب خاندان کا کوئی نہ کوئی فرد ان کے ساتھ ہوتا تھا۔ ان کا جواب تھا، ''نہیں۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں، وہ لوگ مسلمان ہیں اور میں زرتشتی ہوں۔ اس لیے میری ان سے کوئی رشتے داری نہیں۔ مگر آپ مجھے حبیب خاندان کا فرد ہی کہہ سکتے ہیں اس لیے کہ میں نصف صدی سے بھی زیادہ عرصے اس سے منسلک رہا ہوں، جو ایک طویل عرصہ ہوتا ہے۔ ۱۹۴۱ء سے ۱۹۹۷ء تک، چھپن طویل اور اطمینان بخش برس۔''

میں نے ان سے سوال کیا کہ تقسیم کے دنوں میں کیا ان کو کبھی اپنی جان کا خطرہ پیدا ہوا تھا؟ بہت آہستگی، ملائمت اور جذبات سے عاری چہرے سے، جیسے کہ وہ ہمیشہ ہوتے ہیں، انھوں نے ان دنوں کے حالات بتانا شروع کیے۔ ''میں اس وقت کم عمر تھا اور مجھے ان میں سے کچھ واقعات ہی یاد ہیں۔ تفصیلات کو یاد کرنا ذرا مشکل ہوگا۔ مجھے اتنا ضرور یاد ہے کہ ان دنوں سیاست زوروں پر تھی اور حبیب خاندان چوں کہ مسلمانوں کی تحریک سے منسلک تھا اس لیے ان کا خیال تھا کہ پاکستان کے بنتے ہی ان کو اپنا بوریا بستر باندھ کر پاکستان منتقل ہونا ہوگا۔ لہٰذا پورا خاندان، بشمول میری ذات کے، کراچی آ گیا۔ ان دنوں بمبئی میں فسادات ہو رہے تھے۔ مگر ایک غیر مسلم ہونے کی وجہ سے مجھے ذاتی طور پر کبھی کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوا۔ بمبئی شہر میں مسلمانوں کو بھی کوئی خاص خطرہ نہیں تھا۔ ہندو مسلم فسادات ہوتے رہتے تھے مگر ان علاقوں تک محدود رہتے جن میں دونوں قومیں اقلیت میں ہوتیں۔ جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں، چاقو زنی، سیاسی غیر یقینی وغیرہ تو تھی اور سچ مچ حالات خوشگوار نہیں تھے۔ اس لیے حبیب بینک نے اپنے دفاتر کے کچھ حصے بمبئی کے علاقے میرین ڈرائیو میں منتقل کر دیے۔ یہ ایک خوب صورت مقام تھا، جیسا کہ آپ جانتے ہیں، سمندر کے کنارے۔ میرا دفتر بھی وہیں تھا اس لیے کہ میں مرکزی دفتر کا ایک رُکن تھا۔

اپنی سرگزشت کے اس حصے کے بیان کے دوران روسی اپنے مخصوص انداز میں پُرسکون تھے مگر یہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ 'اپنے' حبیب خاندان سے اپنی قربت پر نازاں تھے۔ ہونا بھی چاہیے تھا اس لیے کہ حبیب خاندان نے تقسیم کے دنوں میں ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔

جہاں تک مجھے علم ہے، حبیب خاندان کی داستان ۱۸۴۱ء میں بمبئی سے شروع ہوئی تھی جب تیرہ برس کے ایک نوخیز لڑکے نے اپنے ایک جاننے والے کے کاروبار میں اِدھر اُدھر کے کام کرنا شروع کیے تھے۔ اس لڑکے کا نام حبیب اسمٰعیل تھا۔ وہ ایک مزدور کا بیٹا تھا۔ اس کے باپ کا چند برس ہوئے انتقال ہو گیا تھا اور وہ اپنی ماں اور بہن کا واحد کفیل تھا۔ وہ کاروبار بس عام قسم ہی کا تھا جہاں بے کار لوہے لکڑی، غیر فولادی دھاتیں، مختلف اقسام کے برتن، کپاس اور ابرق وغیرہ کی خرید فروخت ہوتی تھی۔ بالآخر وہ مرچنٹ بینک کے کاروبار میں لگ گیا اور اس کی کمپنی کا نام حبیب اینڈ سنز تھا، بازار میں جس کو احترام کی نظر سے دیکھا جانے لگا تھا۔ حبیب کے چار بیٹے ہوئے اور بمبئی کے اہم لوگوں کی طرح وہ سب ویلنگڈن اسپورٹس کلب سے منسلک تھے۔ وہیں ان لوگوں کی قائدِاعظم محمد علی جناح سے ملاقات ہوئی۔ تیسرے بیٹے محمد علی حبیب قائد سے زیادہ قریب ہو گئے تھے۔ اور اس طرح یہ لوگ جناح صاحب کی سربراہی میں چلنے والی مسلم تحریک میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۴۰ء کی قرارداد کے بعد برطانوی اور ہندو بینکوں نے مسلمانوں کے بڑے کاروبار کے خلاف امتیاز برتنا شروع کر دیا تھا۔ لائڈز بینک نے حبیب اینڈ سنز کے قرض حاصل کرنے کی حد کی تجدید کرنے سے انکار کر دیا۔ اس واقعے نے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ بینکنگ اور مالیاتی سیکٹر اہم ہیں اور چوں کی اس سیکٹر میں مسلمان نہیں ہیں، اس لیے ان کی قومی تحریک کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ لہٰذا حبیب کا مرچنٹ بینکنگ کا سفینہ مالیات کے گہرے سمندروں میں اگست ۱۹۴۱ء میں رواں ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ منصوبہ دراصل قائد کا خیال تھا اور اس کو ان کی مکمل آشیرباد بھی حاصل تھی۔ پاکستان کی نئی مملکت کے لیے یہ ایک نعمت کے مترادف تھا۔ پاکستان بننے کے تین ماہ بعد جب نئی مملکت کو مالیاتی مشکلات درپیش ہوئیں اس لیے

کہ کانگریس کی حکومت نے برطانوی ہند سے پاکستان کو ملنے والا حصہ جاری نہیں کیا تو حبیب بینک نے اس کو پہلا بلا سود قرض فراہم کیا تھا۔

۱۹۴۱ء میں حبیب میں شامل ہونے کے بعد اس قسم کے حالات میں نوجوان روسی ڈُباش کی پرورش ہوئی تھی۔ روسی کہتے ہیں، ''میں نے بینک میں ۱۹۴۹ء تک ملازمت جاری رکھی۔ اس کے بعد محمد علی حبیب کی خواہش تھی اور انھوں نے مجھے بتایا کہ ہندوستان کی سب سے بڑی کمپنی، 'نیو انڈیا' نے حبیب سے اشتراک کی کچھ تجویز بھیجی ہے اور بہت جلد ان کا ایک وفد ہم سے مذاکرات کے لیے کراچی آنے والا ہے۔ اور پھر انھوں نے کہا کہ میری خواہش ہے کہ تم میرے خاندان کے ایک فرد کی حیثیت سے ان معاملات پر نظر رکھو۔ آپ نے دیکھا، انھوں نے مجھ کو اپنے خاندان کا ایک فرد کہا۔ میں نے تجویز کو پڑھا، اگرچہ اس وقت تک میں بیمے کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ اور پھر ان کے ایک اعلیٰ افسر مسٹر ایڈوانی اپنے ایک ڈائریکٹر کے ہمراہ بات چیت کے لیے کراچی آئے۔ مگر تجویز کو پڑھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ تجویز بالکل یک طرفہ تھی۔ اور پھر میں نے حبیب صاحب سے کہا کہ 'نیو انڈیا' ایسی بہت سی چیزوں پر اپنی اجارہ داری چاہتی ہے جسے ہم کرنا چاہ سکتے ہیں۔ بے شک وہ اس صنعت میں قدم رکھنے کے سلسلے میں ہماری مدد کرنے کو تیار ہیں، مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ کس حد تک خود مختار رہیں گے، یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ اور پھر مذاکرات ناکام ہو گئے۔ مگر حبیب صاحب نے مجھ سے کہا کہ اگر تم چاہو تو انشورنس کو شروع کر سکتے ہو، اور میں نے ایسا ہی کیا۔ اس لیے کہ میں انشورنس کے کام کو پسند کرنے لگا تھا۔ مجھے محمد علی حبیب صاحب کے ساتھ کام کرنا اچھا لگا جنھیں میں ہفتہ وار انشورنس کمپنی کی تفصیلات پیش کرتا تھا۔ کچھ عرصے بعد انھوں نے مجھ سے پھر پوچھا کہ میں انشورنس میں ہی کام کرنا چاہوں گا یا بینک میں واپس آنا۔ اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں انشورنس ہی میں کام کرنا چاہوں گا جو اس گروپ کا حصہ تھی۔ اور اس طرح میں کام کرتا رہا، آج تک، اور میں بہت خوش ہوں۔ اب میں کُل وقتی کام سے فارغ ہو چکا ہوں اور مشیر کی حیثیت میں اب بھی حبیب انشورنس ہی سے منسلک ہوں مگر سچ پوچھا جائے تو اب میرے مشورے کی ان کو چنداں ضرورت نہیں ہے۔ حبیب خاندان کی نئی نسل نے سب کچھ سنبھال لیا ہے۔ دراصل شروع ہی سے چاروں حبیب برادران کی بہن کی اولاد ہی انشورنس کمپنی کی کرتا دھرتا رہی ہے۔ جناب محمد، جن سے آپ اچھی طرح واقف رہے ہیں، طویل عرصے تک جنرل منیجر رہنے والے ہی ان کی بہن کے بیٹے تھے۔ ہم صحیح معنوں میں شریکِ کار تھے اور ہم نے درمیانی راستہ اختیار کیا تھا۔ ہم نے کبھی کاروبار کے لیے ضرورت سے زیادہ کوشش نہیں کی ہے۔ ہم نے صرف اپنے گروپ کے کاروبار اور بینک کے چنیدہ گاہکوں کے لیے کام کیا ہے۔ اب ہم نے اپنا طریقِ کار تبدیل کر دیا ہے۔ اب حبیب خاندان انشورنس کے کاروبار کو آہستہ آہستہ پھیلانا چاہتا ہے۔ انھوں نے نئے، تکنیکی اور ایم بی اے کی قابلیت والے لوگوں کو بھرتی کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا ہے، جو اس سے پہلے نہیں کیا گیا تھا۔ اس میں وقت لگے گا مگر آہستہ آہستہ کمپنی متحرّک ہوگی۔ انڈر رائٹنگ تو معیار کے اُصول پر ہی ہوگی مگر عام طور پر کمپنی ذرا زیادہ لچک کا مظاہرہ کرے گی۔''

زیادہ سرمائے کی بنیاد پر، اور حبیب بینک گروپ کی ساکھ کی وجہ سے ان کا انشورنس کا بازو اس وقت سے ایک محتاط رویے پر کاربند رہا ہے جب ۱۹۴۲ء میں اس کو قائم کیا گیا تھا۔ اور جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے یہ دو افراد جناب محمد اور روسی ڈُباش کی انتھک محنت اور یک جہتی ہی کا نتیجہ تھا کہ پچاس برس کے طویل عرصے سے حبیب انشورنس مستحکم بنیادوں پر کام کر رہی ہے۔ ان دونوں نے جب بھی اور جو کچھ بھی کہا وہ ہمیشہ حق تھا۔ ان کے الفاظ پر بلا کسی تردّد کے اعتبار کیا جاتا رہا ہے۔ حبیب انشورنس کمپنی میں چمک دمک کی کمی رہی ہوگی مگر وہ ہمیشہ پیشہ ورانہ مہارت اور صاف ستھرے انداز میں کام کرتی رہی ہے۔ بیمے کی مارکٹ میں اس کی موجودگی نے مارکٹ کو نہ صرف معیار پر عمل کرنے کا طریقہ سکھایا بلکہ اس صنعت کو وقار بھی بخشا ہے۔ جب سے پاکستان میں بیمے کی صنعت کی ابتدا ہوئی ہے حبیب اور ای ایف یو ہی کی بدولت معیار قائم ہوا ہے۔ پاکستان کے قیام کے ابتدائی کچھ دن، مگر مختصر عرصے، تک تو دونوں کمپنیوں نے ایک ہی چھت کے نیچے کام بھی کیا تھا۔ اس زمانے میں جب غیر ملکی کمپنیاں بیمے کی صنعت پر حاوی تھیں تب بھی ان کے خلاف کوئی نفرت یا دشمنی روا رکھی گئی، نہ ہی کسی نوع کے غیر

دوستانہ مسابقت کے کاروباری حربے استعمال استعمال کیے گئے۔ روسی دُباش کہتے ہیں، ''نہیں! نہ ہم حبیب والوں نے نہ ہمارے ای ایف
کے دوستوں نے کبھی غیر ملکی کمپنیوں کے خلاف کاروباری جنگ کی تھی۔ ان کے اپنے گاہک تھے اور ہم کبھی کبھی ان کے حلقے میں داخل ہونے
کی کوشش ضرور کرتے۔ اور یہ ہم اپنی برادری کے رسوخ اور سیاسی رسوخ کے ذریعے کرنے کی کوشش کرتے۔ ای ایف یو میں کے ایف حید
تھے جن کے کافی تعلقات تھے اور حبیب بینک کے ساتھ، ہم اپنی میمن برادری کے رسوخ کو استعمال کرتے۔ رفتہ رفتہ ہم کامیاب ہوتے گئے۔
اگر کوئی مشکل درپیش ہوتی تو ہم کھلے دل سے اپنے غیر ملکی دوستوں سے تبادلہ خیالات کرتے اس لیے کہ ہم ان کو اپنی برادری کا حصہ جانتے
تھے جن سے ہم نے بہت کچھ سیکھا تھا۔ ہم پر حکومت کی جانب سے بڑھتا ہوا دباؤ پڑنے لگا، اور اس پر مستزاد PIC اور NIC کی تشکیل۔
ان سب کی وجہ سے مارکٹ کا منظر بدلتا رہا اور پاکستانی بیمہ کمپنیوں کی آپس میں مسابقت بھی بڑھنے لگی۔ اس کے باوجود، جیسا کہ آپ جانتے
ہیں، ہمارے مابین مسابقت دوستانہ قسم کی تھی۔ ہم لوگ ہفتے میں ایک بار ماموں سجالی یا روشن علی بھیم جی کے مکان پر دوپہر کا کھانا کھاتے اور
، بغیر کسی مروّت کے، ایک دوسرے پر الزامات کی بوچھاڑ کرتے، مگر حقائق اور تفصیلات کے ساتھ۔ لیکن ہمارے درمیان کبھی کوئی تلخی یا اس
نوع کا کوئی مسئلہ اٹھتا، نہ ہمارے درمیان کسی قسم کی اجارہ داری، قیمت بڑھانے کی بات، یا اپنے گاہکوں کے مفاد کے خلاف بیمے کی شرائط
میں کسی قسم کی تبدیلی کا شائبہ بھی ہوتا۔ کبھی نہیں، اس قسم کی کوئی بات نہیں ہوتی تھی۔ یہ سب کچھ ایک دوستانہ برادری کی مانند تھا۔ ہم نے مل
جُل کر کام کیا اور ہمیشہ اپنے ملک کے بیمے کی صنعت کی بہتری کے بارے میں سوچا اس لیے کہ ہمارے غیر ملکی دوستوں کی مالی استطاعت ہم
سے کہیں زیادہ تھی اور ان کو عالمی سطح پر ماہرانہ امداد فراہم تھی۔ لہٰذا ہم اکٹھے ہوئے اور اس وجہ سے ہم طاقتور ہوتے گئے۔ ہاں! ہمارے اپنے
درمیان کاروباری مسابقت تھی، مگر تلخی کے بغیر، اس میں کوئی کثافت نہیں تھی، اور دوستانہ ماحول تھا۔ غور کریں تو آپ دیکھیں گے کہ ساری
مشکلات اور رُکاوٹوں کے باوجود، NIC کی وجہ سے کاروبار میں کمی، اضافہ اور کبھی کبھی PIC کا غیر ضروری ری انشورنس کا جبر، چھوٹی چھوٹی
کمپنیوں کا جگہ جگہ اُگ آنا، اور حکومت کی طرف سے معاملات میں دخل اندازی کے باوجود ہماری صنعت نے نہ صرف ترقی کی ہے بلکہ بڑے
پیمانے پر ترقی کے مراحل طے کیے۔ میرا خیال ہے کہ، سوائے دو ایک بہت چھوٹی کمپنیوں، اور بہت چھوٹی رقم کے، کسی بھی پاکستانی کمپنی کی
طرف سے کسی سنجیدہ قسم کی نادہندگی یا کوتاہی نہیں ہوئی۔ ہمیں اپنی کامیابی پر بجا طور پر فخر ہے۔''

اتنا کہنے کے بعد روسی دُباش نے اپنی آرام کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور وہ نہایت مطمئن انسانی دکھائی دینے لگے۔ وہ 'اپنی'
حبیب انشورنس کمپنی کی نوجوان انتظامیہ کو اب بھی چھوٹے موٹے مشورے دیتے رہتے ہیں اور پرانے ری انشورنس کے دوستوں سے رابطے
میں رہتے ہیں خواہ وہ کہیں بھی ہوں۔ زیادہ تر زیورخ میں رہنے والے دوستوں سے، کیوں کہ بیمے کے پیشے کے لیے زندگی بھر کے لیے خود کو
وقف کردینے والے اس عظیم انسان نے اپنے پیشے سے منسلک رہنے کی ایک اور صورت نکالی ہے اور وہ اس طرح کی اس نے اپنی بیٹی بیمے ہی
کے ایک پیشہ ور انسان سے بیاہ دی ہے جو روسی دُباش کی مارکٹ میں بھی 'اس کی' کمپنی کے مفادات کی دیکھ بھال کرتا رہتا ہے۔

معین فُدّا

قبل اس کے کہ ہم پاکستان کی معاشیاتی ترقی کے بارے میں اس اہم باب کے اختتام تک پہنچیں، میں چاہوں گا کہ میرے قاری
ایک اور شخص سے متعارف ہوں جو اپنی عمر اور دوسری کسوٹیوں پر کسے جانے کی وجہ سے ان لوگوں میں شمولیت کا حق دار نظر نہیں آئے گا جن کو
میں نے بیمے کی صنعت کے اس دور کے تذکرے کے لیے چُنا ہے۔ اس کا شمار نہ بیمے کی صنعت کی بنیادی شخصیتوں میں ہوسکتا ہے نہ ہی کسی
میدان کے پہلکاروں میں اس لیے کہ اس مقام پر جو موضوعِ سخن ہے اور جو کچھ اس وقت ہو رہا تھا، اس وقت تو یہ شخص شاید اسکول کے
قدمچوں تک بھی نہیں پہنچا ہوگا۔ مگر جو کچھ یہ شخص آج کر رہا ہے، اور جس طرح کر رہا ہے، میرے خیال میں، وہ ماضی اور مستقبل کی نسل کے

نظمین، کارکنان اور بیمے کی صنعت کی بہتری کے خواب دیکھنے والوں کے درمیان ایک کڑی کا کام کرے گا۔

یہاں میری مراد جناب معین فدا سے ہے جو اس وقت کمرشل یونین لائف کے چیف ایگزیکٹیو آفیسر ہیں۔ ان سے میری پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب ۱۹۸۲ء میں انھوں نے ریلائنس انشورنس کی ملازمت کی تھی۔ میرے پرانے دوست اور ساتھی جناب عظیم رحیم اپنی کبر سنی کے باعث، ایسٹرن فیڈرل کے چیف ایگزیکٹیو کے عہدے سے سبکدوش ہو چکے تھے اور انھوں نے اس کمپنی کے مالکان سے اس کے قیام میں مدد کرنے کا وعدہ کر لیا تھا۔ اور بزرگ جناب این اے قاضی، سابق چیئر مین NIC اس کے کاروباری سربراہ تھے۔ معین فدا زیادہ دن اس کمپنی میں نہ رہ سکے اس لیے کہ ان کو PIC کی طرف سے ایک بڑی پیش کش ہوگئی اور وہ ترقی کی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے اس کے ایگزیکٹیو ڈائریکٹر بن چکے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب میری ان سے شناسائی ہوئی تھی اور میں ان کے تکنیکی پس منظر، کاروباری باریک بینی، سرعت ادراک اور سب سے اونچا مقام حاصل کرنے کی للک سے متاثر ہوا تھا۔

پاکستان انشورنس کارپوریشن کی عمارت سے قریب، کمرشل یونین کی اپنی عمارت میں واقع، اپنے خوب صورت دفتر میں متمکن معین فدا نے اپنی ذاتی زندگی کی تفصیلات بیان کرنا شروع کیں۔ ان کی پیدائش کراچی میں ایک تاجر کے گھر ہوئی جو افریقا کے ملک موزمبیق سے پاکستان ہجرت کر کے آئے تھے۔ ان کے والد کا زیادہ تر کاروبار پرتگال کے شہر لزبن میں تھا، لہٰذا وہ دراصل وہیں سے آئے تھے۔ ان کی والدہ نے ہندوستان سے پاکستان ہجرت کی تھی۔ ان کے بزرگ کسی زمانے میں ٹھٹھہ، سندھ کے باسی تھے۔ یہ بات ان کو اور ان کے والد کو بعد میں معلوم ہوئی تھی۔ ان کی بنیادی اور کالج کی سطح تک کی تعلیم کراچی میں ہوئی تھی۔ مگر ان کی اعلیٰ تعلیم پہلے تہران میں ہوئی۔

معین فدا نے بتایا کہ "میرے ایک چچا ای ایف یو میں کام کرتے تھے، بلکہ وہ اب بھی وہیں کام کر رہے ہیں اگر چہ وہ کسی بڑے عہدے پر نہیں ہیں مگر ان کو نہ صرف یہ کہ ملازمت پسند ہے بلکہ وہ اس کمپنی کے وفادار بھی ہیں۔ بیمے سے میری بس اتنی شناسائی ۱۹۷۳ء میں ہوئی۔ میں اس وقت ایک طالب علم تھا۔ اس زمانے میں بہت سے لوگ ملک سے باہر جا رہے تھے اور دوسرے لوگوں کی طرح میری بھی خواہش تھی کہ مجھے سمندر پار کوئی موقع مل جائے۔ میں اخبار میں شائع ہونے والے اشتہارات دیکھتا رہتا تھا اور چانک میری نظر ایک وظیفے کے اشتہار پر پڑی جو RCD College of Insurance ایران کے بارے میں تھا۔ میں نے درخواست دے دی۔ اس برس پاکستان سے تین امیدوار لیے جانے والے تھے اور خوش قسمتی سے میں ان تینوں میں سے ایک تھا۔ اس طرح میں اعلیٰ تعلیم کے لیے ملک سے باہر چلا گیا مگر مجھے بیمے کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ میری معلومات بہت تھوڑی تھیں وہ بھی صرف اپنے چچا کی ملازمت کے حوالے سے۔ میں نے انشورنس میں بی ایس سی کیا اور ساتھ ہی ساتھ لندن کے ایک ذرا بڑے بروکر Stewart Wrightson کے تہران میں واقع دفتر میں کام بھی کیا۔ اس طرح تعلیم کے ساتھ ساتھ انشورنس میں ملازمت مجھ کو اس پیشے میں لے آئی۔ مجھے اس طرح سیکھنے کا موقع ملا اور بی ایس سی کرنے کے بعد میں نے اور کچھ کرنے کا ارادہ کیا اس لیے کہ شاید صرف بی ایس سی کر لینا کافی نہیں ہوگا۔ میں نے کچھ رقم پس انداز کر لی تھی اور میں امریکا چلا گیا اور نیو یارک کے کالج آف انشورنس میں داخلہ لے لیا۔ میں نے انشورنس میں ایم بی اے کر لیا، اس میں کافی لطف آیا اور مجھے AIG نے کالج ہی سے اٹھا لیا۔ مسٹر گرین برگ نے مجھے نہیں چنا تھا مگر ان سے ملاقات کے مواقع ضرور ملے تھے اس لیے کہ ان کے ادارے میں اس وقت صرف میں ہی ایک پاکستانی تھا۔ ایک آدھ بار مجھے پاکستان کی فائل بھی دی گئی تھی جو ان لوگوں کی پاکستان کی بیمے کی مارکٹ میں دوبارہ داخل ہونے کی خواہش کے بارے میں ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی تھی، The ALICO File۔ اس طرح کم از کم میں ان کے اس منصوبے سے منسلک رہا تھا۔

پاکستان واپسی پر معین فدا نے، جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں، ریلائنس انشورنس میں شمولیت اختیار کر لی چند برس وہاں کام کیا اور اس کے بعد انھوں نے عالمی سطح کے ادارے، کمرشل یونین گروپ میں ان کے جنرل انشورنس کے سربراہ کی حیثیت سے شمولیت اختیار کر لی،

جو CUGA کے نام سے موسوم ہے۔ شروع دن ہی سے انہوں نے اپنے صدر دفتر کو مشورہ دینا شروع کر دیا تھا کہ وہ پاکستان میں زندگی کے بیمے کے کاروبار میں شرکت کے بارے میں سنجیدگی سے غور کریں۔ اور انھوں نے اپنا ہدف حاصل کرنے میں سب کچھ کیا۔ جب ای ایف یو اور ایک اور کمپنی کو بیمۂ زندگی کے کاروبار کی اجازت مل گئی تو AIG Group اپنے ادارے ALICO کے ذریعے پاکستانی منظر پر نمودار ہوئی۔ اس کے فوراً بعد کمرشل یونین بھی میدان میں آ گئی۔ اس کے بعد سے وہ کمرشل یونین لائف کے سربراہ ہیں اور پاکستانی مارکٹ کے ایک قابلِ قدر حصے کے حصول میں تن، من، دھن سے کوشاں ہیں۔

اس طرح معین فُدا ایک غیر پاکستانی ادارے کے نمائندے ہیں، حالاں کہ دل سے وہ خود کو، تعصب سے مبرّا، کٹر قوم پرست کہتے ہیں۔ ان کو اس وقت شدید صدمہ ہوا جب نیشنل انشورنس ریفارم کمیشن کا قیام عمل میں آیا اور صنعت کے کچھ بزرگوں نے، جن سے ان کے اچھے ذاتی مراسم تھے، اس میں ان کی نمائندگی پر اس لیے اعتراض کیا تھا کہ ان کے خیال میں وہ غیر ملکی مفاد کو ملکی مفاد سے مقدم رکھیں گے اس لیے کہ وہ ایک کثیر القومیاتی ادارے کے لیے کام کر رہے ہیں۔

انھیں آج بھی اس بات کا صدمہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''ہر شخص کو اپنی دال روٹی کے لیے کام کرنا ہوتا ہے مگر آپ قومی معاملات میں سمجھوتا نہیں کرتے خواہ وہ آپ کا 'مادر ادارہ' ہی کیوں نہ ہو۔ اور آج جب مجھے عالمی بینک سے بات کرنی ہوتی ہے تو، بہت سے لوگ گواہ ہیں کہ، میں اپنے ملک کی صنعت کے حوالے سے بات کرتا ہوں۔ پہلے میں قومی مفاد کو سامنے رکھتا ہوں پھر اپنی دال روٹی یا کچھ اور۔''

معین فُدا، بے شک، اپنی نوزائیدہ کمپنی کی بڑی کامیابی کے لیے کوشاں ہیں اور اس طرح وہ ای ایف یو لائف کے، جو پرانی اور نئی مارکٹ دونوں کی سب سے بڑی کمپنی رہی اور اب بھی ہے، سب سے بڑے حریف ہیں۔ وہ اس بات سے پوری طرح واقف ہیں اور محاذ پر موجود ان کے 'دوستانہ دشمن' بھی۔ ایسے معاملات میں شاید ہم کو اعجاز اللہ صدیقی اور روسی دُباش جیسے لوگوں کے فرمودات سے سبق لینا ہوگا کہ پاکستان کے قیام کے بعد ہی سے وہ لوگ پچھلے چار پانچ عشروں میں ایسے ہی حالات سے دوچار رہے تھے۔ عالمی سطح کے اور بھی کھلاڑی پاکستان کے ساحلوں پر لنگر انداز ہوں گے۔ ان میں سے کچھ مقامی کمپنیوں سے اشتراک کے خواہش مند ہوں گے۔ 'عالمگیریت' (globalisation) ایک دن ہمارے ملک کے مزید ترقیاتی معاملات پر اثر انداز ہوگی اور اس میں بیمے کی صنعت کا متاثر ہونا لازمی ہے۔ اس کا ثبوت پاکستان کے سب سے پرانے بیمے کے ادارے، ایسٹرن فیڈرل اور بین الاقوامی سطح پر سب سے بڑی کمپنیوں میں سے ایک، یعنی جرمنی کی Allianz کے درمیان ہونے والا معاہدہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں معین فُدا جیسے لوگوں کو اس قسم کی 'بین الاقومیت' کا نمائندہ سمجھتا ہوں۔ ملکوں میں معاشی اور سیاسی ترقیات لہروں کی صورت میں ہوتے ہیں۔ یہی کچھ بیمے کی صنعت میں بھی ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے پچھلے چند برسوں میں مشاہدہ کیا ہے، دنیا بھر میں گاہک بڑے اداروں کو فوقیت دیتے ہیں۔ ایک زمانہ وہ تھا جب حکومت کو کسی مقامی صنعت کی ترقی اور بقا کے لیے اس کی حفاظت کی ضمانت دینی پڑتی تھی۔ جہاں تک پاکستان کا سوال ہے، یہ سب کچھ بہت دھیرے دھیرے اور غیر جارحانہ انداز میں کیا گیا تھا مگر پھر مارکٹ کی طاقت نے یہ فیصلہ کرنا شروع کیا کہ بیمے کی صنعت کی صورت کیا بنے گی۔ کسی کو کوئی خاص نقصان نہیں ہوا۔ یہ سب اب تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اس صنعت کے پچاس برسوں میں حاصل ہونے والے تجربے کی بنا پر مارکٹ میں روبہ عمل لوگوں کو یہ خیال رکھنا پڑے گا کہ اس نوع کی آنے والی لہریں تباہ کُن لہروں کی صورت نہ اختیار کر لیں اور جو کچھ بھی ہو، وہ شریفانہ انداز میں ہو اور قابو سے باہر نہ ہونے پائے۔

مجھے اس بات پر مسرت ہے کہ معین فُدا جیسے لوگ بڑی پاکستانی کمپنیوں کے سربراہوں کے ہمراہ اس بات کو یقینی بنائیں گے کہ جو کچھ بھی ہو اس صنعت کے وقار میں اضافے کے لیے ہو اور عوام کی بہتر اور مکمل انداز میں خدمت کا سامان ہو سکے۔

روشن علی بھیم جی امریکا کی شمال مغربی میچول لائف انشورنس کمپنی کے بورڈ کے چیئر مین رابرٹ ای ڈینن
سے گفتگو کرتے ہوئے

تیسرا باب

ناقابلِ فراموش افراد

خاکے اور حالاتِ زندگی

تجارتی اور صنعتی مہم جوئی کے نقطۂ نظر سے قوموں کی تاریخ دراصل اس کے لوگوں کی تاریخ ہوتی ہے۔ یہ ایسے ممتاز لوگوں کی داستان ہوتی ہے جو قوموں کی بنیاد رکھنے یا ترقی کے میدان میں اس کی رہنمائی کے موجب ہوتے ہیں۔

جہاں تک قوموں کا معاملہ ہے، ذرا پہلے برطانوی ہند کی تقسیم اور پاکستان کے قیام کے تاریخی پس منظر میں ہم یہ سب بہت واضح انداز میں دیکھ چکے ہیں۔ ہم نے یہ بھی دیکھا کہ سرسیّد، اقبال، جناح اور دوسری بلند و بالا مینار جیسی شخصیتیں نہ صرف اثر انداز ہوتی ہیں بلکہ اپنے زمانے اور اپنے معاملات واسباب کے آسمانوں پر چھا جاتی ہیں۔

جیسا کہ میں ابتدایے میں عرض کر چکا ہوں، اس کتاب کا مقصد پاکستان کے قدیم تجارتی اداروں میں سے ایک اہم ادارے یعنی ای ایف یو گروپ کے تاریخی پس منظر سے قارئین کو متعارف کرانا ہے۔ اور اس سے بہتر اور کوئی طریقہ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں ان افراد کی داستانِ زندگی بیان کروں جنھوں نے اپنے اپنے مخصوص انداز میں اس عظیم اور ہراول ادارے کی ترقی میں کردار ادا کیا ہے۔ لہٰذا میں مندرجہ ذیل خاکوں کو اس کتاب کے بطن کے مماثل سمجھتا ہوں اور مجھے قوی امید ہے کہ میرے قارئین بھی ان کو پڑھنے کے بعد اسی نتیجے پر پہنچیں گے۔

مجھے یقین ہے کہ لوگ مجھ سے سوال کریں گے کہ آپ نے کس معیار کے پیمانے پر صرف ان لوگوں کا انتخاب کیا ہے جن کے حالاتِ زندگی اس کتاب میں درج کیے گئے ہیں۔ اور مجھے اس بات پر ہرگز حیرت نہیں ہوگی، اگر میرے جوابات ہر ایک کی تشفی کے لیے کافی نہیں ہوئے۔ اس کے باوجود میرے خیال میں جواب بالکل سیدھا سادہ ہی سا ہے۔ سب پہلے تو یہ عرض کرنا ہے کہ میں صرف ان لوگوں کے بارے میں لکھ سکتا تھا جن کو میں یا تو ذاتی سطح پر جانتا تھا، جانتا ہوں یا جن کے بارے میں ان کے اعزہ، اقربا اور دوستوں نے اپنے محسوسات کی بنیاد پر مجھے معلومات فراہم کی ہیں۔ یا پھر جن لوگوں کی بابت کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور ان کے نسخے اب بھی دستیاب ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کتاب کی تحریر کبھی کبھی 'ہمالیائی مہم' لگی اور میں ممنون ہوں ان سب افراد کا جنھوں نے اس کو سر کرنے میں میری معاونت فرمائی۔ اور جب میں پلٹ کر دیکھتا ہوں تو یک گونہ سکون کا احساس ہوتا ہے کہ مخلصانہ اور بے غرض مددگاروں کی معاونت سے ان سب شخصیات کے بارے میں لکھنا میرے لیے ممکن ہوا۔ اور اگر ای یف یو کی بنیاد یا اس کی ترقی میں معاون ہونے والوں کے رنگا رنگ نگار خانے میں ایک آدھ نقش شامل ہونے سے رہ گیا ہے تو کلّی طور پر صرف مواد کی عدم فراہمی ہی اس کا باعث ہوئی ہے۔ بہرحال اس انتخاب کی پوری ذمے داری مجھ ہی عائد ہوتی ہے اور اگر کوتاہی یا نسیان کے سبب کچھ چھوٹ گیا ہے تو اس کے لیے میں صمیمِ قلب سے معذرت کا طلب گار ہوں۔

اور میں اپنے قارئین سے درخواست کروں گا کہ وہ صرف صفحات کی گنتی سے شخصیات کی اہمیت، احترام اور ان کے مقام کا تعین

کرنے کی غلطی نہ کریں جو میرے اور دوسرے حضرات وخواتین کے دلوں میں نقش ہیں۔ میں نے اس مواد ہی پر انحصار کیا ہے جو بہ وقتِ تمام مجھے حاصل ہو سکا ہے۔

پھر بھی ایک چیز ضرور تھی جو میرے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔ شروع ہی سے میرا پختہ ارادہ تھا کہ میں نہ صرف ان لوگوں پر لکھوں گا جو تاریخی حیثیت کے حامل ہیں یا پھر وہ جو ملک میں اچھی طرح سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ میں نے یہ بھی چاہا ہے کہ میرے قارئین کم از کم ان چند لوگوں سے بھی متعارف ہوں جو ہر ادارے میں پردے کے پیچھے اہم، اور ناقابلِ فراموش کردار ادا کرتے ہیں مگر کبھی روشنی میں نہیں آتے اور وقت آنے پر ملازمت سے فارغ ہوتے ہی بھلا دیے جاتے ہیں۔

اور ایک تیز نظر قاری یہ بھی سوچنا شروع کر دے گا کہ کرشماتی اور سر برآوردہ شخصیتوں میں سے وہ جن کی زندگی اور جن کے کارنامے چالیس برس تک ای ایف یو کی نشوونما پر اثر انداز ہوئے ہیں اس کتاب میں نظر نہیں آتے: یعنی جناب روشن علی بھیم جی، جو دسمبر ۱۹۹۸ء میں اپنے انتقال سے صرف چند دن قبل تک کمپنی کے بے حد محترم اور سرگرم چیئرمین رہے تھے۔

اس کا جواب بھی بہت آسان سا ہے۔ ان کے بہت سے دوستوں کی فرمائش پر میں نے ان کی سوانح حیات علیحدہ تحریر کی ہے جو اس کتاب کے ساتھ ہی شائع کی جا چکی ہے۔

اس کے علاوہ قاری کو بہت جلد ہی احساس ہو جائے گا کہ وہ اس کتاب کی زرنگار کے معشوق بھی ہیں اس لیے کہ ان کی حیات بیشتر داستانوں سے جو میں نے بیان کی ہیں، اس طرح مشتق ہیں کہ اس کو الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔

سرپرست

عالی مرتبت نوّاب بھوپال

عالی مرتبت آغا خان

عالی مرتبت نوّاب بھوپال (اندازاً ۱۹۴۲ء)

نواب بھوپال ۳۰ء کی دہائی کے اوائل میں

نواب بھوپال اپنے محل میں صاحبزادی، اپنی جانشین شہزادی عابدہ، اہلیہ اور دوسرے افراد کے ساتھ

عالی مرتبت نوّاب بھوپال

برطانیہ کے روایتی بادشاہ آرتھر کی سوانح حیات اور کیملاٹ کے دربار کی گول میز کے سورماؤں کے معرکوں پر قرونِ وسطیٰ اور جدید دور کے لکھنے والوں نے ایسی داستانیں تخلیق کی ہیں جو بہت سی روایتوں کا حصہ ہیں۔ اس کے برعکس بھوپال کے مرحوم نواب کی حیات، جو آغا خان کے ہمراہ ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی کے دوسرپرستوں میں سے ایک تھے جب ۱۹۳۲ء میں اس ادارے کی داغ بیل رکھی گئی تھی، حقیقت پر مبنی ہے اور ہندوستان کے مسلمانوں کی جدو جہدِ آزادی اور تقسیم ہند پر لکھے جانے والی تاریخ کا ایک درخشاں باب بھی ہے۔

آزادی سے قبل کے ہندوستان کا سیاسی نقشہ صوبوں اور رجواڑوں سے مزین سندھی رلّی کا منظر پیش کرتا تھا۔ دوسری عالمی جنگ کی ابتدا کے وقت ۵۶۲ ریاستیں تھیں جن میں تقریباً دس کروڑ لوگ بستے تھے جو پورے ہندوستان کی آبادی کے بیس فی صد کے برابر تھے۔ ان میں کچھ ریاستیں بہت بڑی تھیں، جیسے حیدرآباد، میسور اور کشمیر جب کہ ان کی اکثریت چھوٹی، مخفف، اور ماضیِ قریب کی باقیات جیسی تھیں۔ ان میں سے تین سو کا مجموعی رقبہ مشکل سے ۶۰۰۰ مربع میل کے برابر تھا اور ان کی آبادی دس لاکھ سے کم تھی۔ کچھ ریاستیں صرف چند ایکڑ اور ان کی کُل 'آبادی' پچاس افراد پر مشتمل تھی۔

بڑی ہوں یا چھوٹی، ان کا سیاسی رُتبہ اُن کے حاکم اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے درمیان ہونے والے معاہدے کا نتیجہ تھا۔ اگر چہ ان کا قد، آبادی، مالیات اور دیے جانے والے حقوق وغیرہ پر منحصر تھا۔ ایک بات سب میں مساوی تھی اور وہ یہ تھی کہ ان کا علاقہ برطانوی تسلط میں نہیں تھا اور ان کی رعایا تاجِ برطانیہ کے ماتحت نہ تھی۔ چھوٹی سے چھوٹی ریاست میں بھی برطانوی ہند عدالتوں کے قوانین نافذ نہیں تھے اور ہندوستان کی مقننہ کے بنائے ہوئے قوانین ان پر لاگو نہیں ہوتے تھے، سوائے ان لوگوں پر جو برطانوی قومیت رکھتے تھے۔ قانونی اعتبار سے وہ سب ہندوستان کے لیے غیر ملکی علاقے تھے۔

۱۸۵۷ء کے 'غدر' کے دوران زیادہ تر شہزادے تاجِ برطانیہ کے وفادار رہے جس کے عوض بہت سے مقامی حاکموں کو سندیں دی گئی تھیں کہ ان کے تخت برقرار رہیں گے اور، جہاں ضروری ہو، ان کو اپنے وارث بنانے کے پورے اختیارات ہوں گے۔ اگر چہ ساری ریاستیں 'غیر ملکی علاقے' تھیں اور ان کے حکمراں اپنے علاقے کے معاملات میں خود مختار تھے، اعلیٰ ترین فرماں روائی کا اختیار برطانیہ کے پاس تھا جس کا مطلب یہ ہوا کہ ان سب کے اختیار کے لیے کچھ حدود تھیں۔ مثال کے طور پر کوئی ریاست غیر ملکوں سے تعلقات استوار نہیں کر سکتی تھی اور ہندوستانی ریاستوں کے مابین مراسلت برطانوی حکومت کے مقرر کردہ وائسرائے کے معرفت کی جائے گی۔ ریاستی حکمرانوں کو بدنام کرنے کے لیے بہت کچھ لکھا گیا ہے جن کی ریاستوں کو 'جدید عہد کی برخود غلط مطلق العنانیت کے جوہڑ' سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ اس کے باوجود درحقیقت ان میں اچھے جو تھے وہ آمر تو تھے مگر مخیّر اور فیض رساں تھے اور ان کی ریاست اچھی اور ترقی پسندانہ شمار کی جاتی تھی۔ زیادہ تر بالکل انگریز

اشرافیہ کی طرح کی زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ غیر ملکوں کے سفر کرتے تھے، لندن، پیرس اور جنوبی فرانس کے ساحلی جزائر میں ان کے قیام کے لیے مکانات تھے۔ کچھ تو بڑے شکاری اور کھلاڑی بھی تھے، اپنے اصطبل اور شکارگاہوں پر خطیر رقمیں خرچ کرتے تھے، شیر چیتے اور دوسرے وحشی جانور پالتے تھے۔ اور ان میں سے کچھ تو اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے، روشن خیال بھی اور ترقی پسند سوچ رکھنے والے تھے۔

لہٰذا اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ رجواڑے اور نوابیاں قرونِ وسطیٰ کے مُردآب جیسے نہیں تھے اور یہ باور کرنے کی بہت سی وجوہات موجود ہیں کہ بھوپال کی ریاست ان رسوخ والی ریاستوں میں سے ایک تھی جو بلا کسی تردّد کے تعلیم، صحتِ عامہ اور عورتوں کی ترقی کے معاملے میں برطانوی ہند سے زیادہ ترقی یافتہ تھی۔

اس کو بآسانی اس طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ بھوپال کی آخری نواب سے قبل، جن کے حق میں ان کی دادی ۱۹۲۶ء میں حکمرانی سے دست بردار ہوگئی تھیں، اس ریاست پر خواتین کی حکمرانی رہ چکی تھی۔ نواب سر محمد حمید اللہ خاں، بھوپال کے حکمران، تقسیمِ ہند سے قبل ہندوستان کے راجاؤں اور نوابوں میں سب سے ممتاز حاکم تھے۔ اس لیے یہ اور بھی حیرت کی بات ہے کہ کسی مؤرخ یا ادیب نے ابھی تک اس بے حد روشن خیال، ذہین، خوب صورت، شجاع اور دل چسپ آدمی کی سوانح عمری لکھنے کی کوشش نہیں کی، جس کو برطانیہ عظمیٰ کی حکومت کی جانب سے ہندوستان میں متعین آخری وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن، ہندوستان میں نہرو کے بعد دوسری بہترین اور مقرب شخصیت گردانتے تھے۔ عوامی اطلاع کے مطابق جناح صاحب کی طرح نواب صاحب بھی یادداشتیں لکھنے والے آدمی نہیں تھے اور اس زمانے کے جو لوگ اپنی یادداشتیں چھوڑ گئے ہیں ان میں بھی نواب صاحب کے ذاتی زندگی کے بارے میں تفصیلی معلومات نہیں ملتیں۔ صرف چودھری خلیق الزماں وہ واحد شخصیت تھے جس نے اپنی تحریر 'Pathway to Pakistan' میں نواب صاحب سے اپنے روابط کی مختصر مگر بہت واضح تفصیلات چھوڑی ہیں جن سے آگے چل کر میں اپنے قارئین کو روشناس کراؤں گا۔

تحریری مواد اور اطلاعات کی کمیابی کے باوجود پاکستان کی دھرتی پر قدم رکھتے ہی مجھے مرحوم نواب صاحب کے زندگی اور شخصیت سے واقفیت ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جس وقت میں ایسٹرن فیڈرل یونین سے منسلک ہوا اس وقت اتفاق سے کے ایف حیدر صاحب ادارے کے جنرل منیجر تھے جو تقسیم سے قبل نواب صاحب سے بہت قریب رہ چکے تھے۔ بھوپال کے وزیرِ خزانہ اور دوسری حیثیتوں میں ان کو نواب صاحب کی خدمت کے مواقع ملے تھے بلکہ تقسیم کے بعد بھی وہ سفر میں ان کے مستقل ہمراہ ہوا کرتے تھے۔ پہلے ہی دن سے جب حیدر صاحب سے میری ملاقات ان کے دفتر میں ای ایف یو کے چیف ایگزیکٹو کی حیثیت سے ہوئی تھی، اکثر و بیشتر 'ہز ہائی نیس نواب' سے اُن کے واجب التکریم تعلقات کے واقعات میرے کانوں میں پڑتے رہے تھے۔ اور کچھ دنوں بعد تو مجھے ایسا محسوس ہونے لگا تھا گویا نواب صاحب سے میرے بہت قریبی تعلقات رہ چکے تھے، حالاں کہ اس وقت (۱۹۶۰ء میں) جب مجھے کراچی آئے ہوئے چند مہینے ہی گزرے تھے، ان کا انتقال ہو چکا تھا۔

اسی طرح میرے ایک اور قریبی ساتھی اور دوست جناب معین الدین بھی، جو نواب صاحب کی ملازمت میں رہ چکے تھے، ان کی تعریف میں رطب اللسان رہا کرتے تھے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ اس وقت مجھے اس بات کا گمان بھی نہیں تھا کہ چالیس برس بعد میرا ان کی زندگی سے پھر سابقہ پڑے گا، اور اس بار کہیں زیادہ تفصیل میں اور بہت قربت کے انداز میں۔ یقیناً اس وقت میں اس انسان کی زندگی اور اس کے دل چسپ پہلوؤں کے بارے میں شذرے لکھ کر ڈال سکتا تھا، جو آج، اتنا وقت گزرنے کے بعد زیادہ تر میرے ذہن سے محو ہو چکے ہیں۔

بہر حال اس کے ازالے کے طور پر، میں بہت خوش قسمت ہوں کہ مجھے نواب صاحب کی سب سے بڑی بیٹی سے، جو ان کی ولی عہد تھیں، ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے اور نہ صرف یہ کہ بہ کمالِ مہربانی انھوں نے مجھے (کراچی کے مضافاتی علاقے) ملیر میں اپنی وسیع و عریض قیام گاہ پر ایک طویل ملاقات کا شرف بخشا تاکہ میں ان سے کسی قسم کے سوالات کر سکوں۔ حالاں کہ وہ اس وقت گر کر زخمی ہو جانے

کے باعث بستر سے اُٹھ بھی نہیں سکی تھیں پھر بھی بڑی خندہ پیشانی سے انھوں نے بے حد صبر اور خوش دلی سے میرے سوالات کے جوابات بھی دیے اور بہت سی خالص ذاتی باتیں بھی بتائیں۔

اس مسحور کن اور بے حد متحرک عالی شان عمر رسیدہ خاتون سے میری بے حد دل چسپ اور جذبات انگیز گفتگو کا وسیلہ تھیں جناب کے ایف حیدر کی صاحب زادی جواب بھی شہزادی عابدہ سلطان سے رابطے میں تھیں۔ جن درجنوں سر برآوردہ شخصیتوں سے میری ملاقاتیں ہو چکی ہیں ان میں سب سے نمایاں ملاقات وہی تھی جو اس غیر معمولی خاتون سے ہوئی تھی۔ غیر معمولی صرف تاریخ کے اس آتشدان سے قربت اور ذاتی لگاؤ کی وجہ سے نہیں جس کے سلسلے میں یہ ملاقات ہو رہی تھی، بلکہ جس حقیقت پسندانہ اور فطری انداز میں انھوں نے برطانوی راج کے ایک اہم ستون اور دوسرے ہندوستانی شہزادوں کے بارے میں مجھے آگاہ کیا تھا۔ اس طرح مجھے ہندوستان کی تاریخ کے اس پہلو پر ایک حقیقی نظر ڈالنے، سمجھنے اور بہتر انداز میں دیکھنے کا اور ان غیر معمولی اور ترقی پسند شاہی شخصیتوں کو بہتر انداز میں سمجھنے کا موقع مل گیا، کے ایف حیدر جیسے لوگ جن کے بارے میں باتیں کیا کرتے تھے۔

بھوپال کی حکمرانی کی بنیاد ایک قسمت کے دھنی پٹھان یا افغان دوست محمد خاں نے رکھی تھی جس نے ۱۷۰۷ء میں شہنشاہ اورنگزیب کے انتقال کے بعد خود کو بھوپال کا خود مختار حکمراں ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔ بھوپال کی پہلی خاتون حکمران نواب قدسیہ بیگم تھیں جو، شہزادی عابدہ سلطان کے مطابق پڑھی لکھی نہیں تھیں حتیٰ کہ وہ دستخط بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ ان کی عمر اس وقت اٹھارہ برس تھی جب ان کے حکمران شوہر کو قتل کر دیا گیا تھا، اور ان کی صرف دو برس کی ایک بیٹی تھی۔

غیر تعلیم یافتہ سہی مگر وہ بڑی دور رس نگاہیں رکھنے والی اور چالاک عورت رہی ہوں گی اس لیے کہ انھوں نے خاندان کے تمام مردوں کا ڈٹ کا مقابلہ کیا اور بالآخر اپنی بیٹی کو ریاست کا ولی عہد بنانے میں کامیاب رہیں۔ انھوں نے اپنی بیٹی کو تمام فنونِ حرب کی تربیت دلوائی تا کہ وہ اندرونی اور بیرونی جنگ و جدل کے خطرات سے کامیابی سے نبرد آزما ہو سکے۔ ان کا ۱۸۳۷ء میں انتقال ہوا اور ان کے بعد ان کی بیٹی سکندر بیگم (۱۸۶۸ء۔ ۱۸۱۶ء) ریاست کی محبوب اور مؤثر حکمران بنیں۔ شہزادی عابدہ سلطان کی بلند مرتبت دادی سلطان جہاں بیگم (۱۹۳۰ء۔ ۱۸۵۸ء) ریاست میں خواتین حکمرانوں کے سلسلے کی آخری کڑی اور بہت کامیاب حکمران تھیں۔ ۱۸۷۴ء میں انھوں نے جلال آباد کے افغان اشرافیہ کے خاندان میں شادی کی اور ان کے ہاں دو بیٹیاں اور تین بیٹے تولد ہوئے، سب سے چھوٹے شہزادے محمد حمید اللہ خاں تھے جو ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوئے تھے، اور ۱۹۲۶ء میں 'ہمارے' نواب صاحب بھوپال کے حکمراں بنے۔

شہزادی عابدہ سلطان نے دسمبر ۱۹۹۷ء میں اپنی قیام گاہ پر مجھے خوش آمدید کرتے ہوئے بتایا کہ ''میری دادی کے پانچ بچے تھے، اور میرے والد سب سے چھوٹی اولاد تھے۔ دو بیٹیوں کا چودہ اور پندرہ برس کی عمر میں انتقال ہو گیا تھا۔ صرف تین بیٹے زندہ رہے تھے جن میں سب سے بڑے نواب نصر اللہ خان ولی عہد تھے اور میرے والد کے نواب بننے کا کوئی امکان ہی نہیں تھا مگر دونوں بڑے بھائی پانچ مہینے کے فصل سے ۱۹۲۴ء میں انتقال کر گئے۔

مروّجہ قوانین کے مطابق ولی عہد کا بیٹا اپنے باپ کی جگہ لیتا تھا۔ میری دادی جو ابھی جوان تھیں، حکمران تھیں مگر ان سے اور ان کی اولاد سے اس لیے نالاں رہتی تھیں کہ انھوں نے اولاد کی صحیح تربیت نہیں کی تھی۔ وہ کبھی اسکول نہیں گئے، گھر پر ان کی تعلیم ہوئی جہاں امیر گھرانے کے ہندوستانیوں کی طرح ان کے نازنخرے اُٹھائے جاتے تھے۔ میری دادی ان کو پسند نہیں کرتی تھیں۔ ان کے شوہر کا اس وقت انتقال ہو گیا تھا جب میرے والد، سب سے چھوٹی اولاد، صرف چھ برس کے تھے اور ان کی تربیت انھیں کے مزاج کے مطابق ہوئی تھی۔ وہ بہت روشن خیال اور ترقی پسند خاتون تھیں۔ وہ بچوں کے بہت زیادہ نازنخرے اُٹھا کر ان کو خراب کر دینے کی قائل نہیں تھیں۔ انھوں نے ایک بہت ہمت والا قدم اُٹھایا اور میرے والد کو پڑھنے کے لیے علی گڑھ بھیج دیا گیا۔ میرے دادا اگر کچھ اور دن زندہ رہ جاتے تو میرے والد کو علی

گڑھ کی صورت دیکھنے کا کبھی موقع نہ ملتا، نہ ہی ان کو مولانا محمد علی، شوکت علی، جناح، نہرو، گاندھی تمام سربرآوردہ سیاست دانوں سے ملنا نصیب نہ ہوتا جو ہندوستان کی آزادی کی تحریک کے سرخیل تھے۔ جب کہ ان کے دونوں بڑے بھائیوں کو ہندوستان کی سماجی اور سیاسی صورتِ حال کا ادراک نہ تھا۔ بھوپال کے اندر جو کچھ ہو رہا تھا وہ بس اس میں دل چسپی رکھتے تھے۔ میرے والد تعقّل اور سیاست کے گمبھیر بھنور یعنی 'علی گڑھ تحریک' کے بیچوں بیچ تھے، اس لیے ان پر 'برطانیہ مخالف' کی چھاپ لگا دی گئی تھی۔ اور چوں کہ ولی عہدی اور نوابی سے ان کو بظاہر دور کا بھی واسطہ نہ تھا اس لیے جب تک وہ علی گڑھ میں تھے ان پر ہندوستان کے ان سیاسی لیڈروں سے ملنے جلنے پر کوئی قدغن نہ تھی۔ اس طرح انھوں نے علی گڑھ جیسی زندگی کو اپنایا اور واقعتاً وہ دل سے برطانیہ کے مخالف تھے۔

مسلم لیگ کے ایک اہم لیڈر چودھری خلیق الزماں ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۶ء تک علی گڑھ میں رہے تھے، اس لیے شہزادہ حمید اللہ خان سے ان کی ملاقات تھی۔ اپنی یادداشتوں میں نواب صاحب کے بارے میں انھوں لکھا ہے، ''۱۹۱۰ء میں شہزادہ حمید اللہ خاں اس ادارے میں داخل ہوئے، جو بھوپال کی بیگم کے تیسرے بیٹے تھے۔ سرسیّد کورٹ کا کمرہ نمبر ۳۳، جس میں میرے پیارے دوست اور ہاکی کے کپتان نورالدین، اسد علی کے بھائی سرور علی وغیرہ کی، جو ہاکی کے بے مثل کھلاڑی تھے، جولانگاہ بن چکا تھا جس میں حمید اللہ خاں بھی شامل ہوتے تھے۔ اگر چہ حمید اللہ خان بورڈنگ ہاؤس کے احاطے کے باہر واقع ایک بنگلے میں رہتے تھے مگر وہ رات گئے تک ہم لوگوں کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ ان میں وہ مریضانہ جھینپ اور شرمیلاپن نہیں تھا جو دنیا سے الگ، کاسہ لیسوں اور خوشامدی افراد سے بھری حرم جیسی زندگی میں پلنے بڑھنے کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے نہ ہی ان میں تکبّر اور غرور کا دور دور شائبہ تھا۔ وہ صرف نام کے شہزادے تھے ورنہ ان کا رہن سہن، اوڑھنا پہننا، عادتیں اور انسانوں میں آپس کی برابری جیسے خیالات، آزاد خیالی اور عوام کی خدمت وغیرہ ویسے ہی تھے جیسے کہ ایک عام آدمی میں ہوتے ہیں۔ اس زمانے اور عمر میں بھی وہ بہت سمجھ دار انسان تھے مگر ان میں دل و دماغ کی جو خوبیاں مسلمانوں کی دوسری سب سے بڑی ریاست بھوپال کے نواب کی حیثیت میں نظر آئیں، وہ اس وقت کے بیشتر مسلمان سیاست دانوں سے کہیں بڑھ کر تھیں۔ وہ بڑی مشکل میں تھے۔ اگر وہ ہندوستانی سیاست کے تمام الجھاؤ کی آگ میں تپ کر اپنی وسعتِ نظری، اور قومی نظریات کے ساتھ ملکی سیاست میں آتے تو شاید وہ ہندوستان کے گروہی مسائل کا حل پیش کر سکتے تھے۔ ان کی بدقسمتی یہ تھی کہ وہ ایک نواب تھے۔''

اب وہ وقت آ گیا تھا کہ ہندوستان کی دوسری ریاستیں کھل کر مسلمانوں کے ساتھ ہو گئی تھیں۔ اس وقت کے راجا صاحب محمود آباد یونی ورسٹی فنڈ کے نائب صدر تھے، وہ فنڈ جو آغا خان کی سرپرستی میں جمع کرنے کی مہم چلائی گئی تھی اور جنھوں نے مولانا محمد علی کے ہمراہ پورے ہندوستان کا سفر کیا تھا اور چندے کے لیے اپیل کی تھی۔ اسی زمانے میں طرابلس کے ترک باشندوں پر اطالیہ کے حملوں کے خلاف طالب علموں نے علی گڑھ میں شدید مظاہرے کیے تھے اور خلیق الزماں نے ہمیں بتایا کہ، ''حمید اللہ خان اپنی حیثیت کے باوجود ہمارے ساتھ تھے'' اور ان کو ان برطانیہ مخالف قوتوں سے قربت محسوس ہوئی ہوگی اس لیے کہ بقول خلیق الزماں، جنھوں نے انھی دنوں لکھنؤ میں وکالت شروع کی تھی، وہ علی برادران کی طرف سے حمید اللہ خان کے نام ایک پیغام لے کر جا رہے تھے جس میں یہ اطلاع بھیجی جا رہی تھی کہ اگر کھلی بغاوت کی ضرورت پڑی تو بھوپال ان کا مرکزی مقام ہوگا۔ علی برادران اور دوسروں نے خلافت تحریک کے لیے جو کام کیے تھے، میں نے عبدالرحمٰن صدیقی کے خاکے میں ان کا تفصیل سے تذکرہ کیا ہے۔ مولانا محمد علی دہلی سے جاری ہونے والے مشہور انگریزی ہفتہ وار اخبار 'کامریڈ' کے بانی، ناشر اور اڈیٹر تھے، انگریزی اور اردو دونوں زبانوں کے بہت طاقت ور صحافی تھے۔ 'The Choice of Turks' کے عنوان سے ۱۹۱۵ء میں اخبار 'کامریڈ' میں ایک سلسلے وار مضمون لکھنے اور شائع کرنے پر ان پر عدالت میں مقدمہ چلایا گیا اور سزا ہوئی۔ اس مضمون میں انھوں نے پہلی جنگِ عظیم میں برطانیہ کے خلاف ترکوں کی شمولیت کے فیصلے کو جائز قرار دیا تھا۔ ۱۹۱۹ء میں رہائی کے بعد انھوں نے اردو زبان میں 'کامریڈ' کا اجرا کیا اور کئی برسوں تک وہ مسلم تحریک کا غیر سرکاری ترجمان رہا۔ تعجب نہیں کہ برطانوی حکومت شہزادہ حمید اللہ خاں کی

وراثتِ تخت کے سخت خلاف تھی، جس کے حق میں ان کی ماں بڑی تن دہی سے لڑتی رہی تھیں۔

ان (شہزادہ حمید اللہ خان) کے دو بڑے بھائی ۱۹۲۴ء میں انتقال کر گئے، اس لیے وراثت کا مسئلہ طے ہونا تھا۔ اس زمانے میں ہندوستان کا وائسرائے لارڈ ریڈنگ تھا اور وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ موجودہ ولی عہد کا بیٹا ہی وارث ہوگا۔ مگر شہزادی عابدہ سلطان کے مطابق ''دادی نے کہا نہیں'' ان کی اب بھی توانا آواز اور بھی مستحکم ہو جاتی جب وہ اپنی دادی کی داستان بیان کرتیں، جن کو وہ بہت چاہتی تھیں اور جنھوں نے برطانیہ سے اپنے بیٹے کی وراثت کی جنگ لڑی تھی۔ ''انھوں نے اسلامی قانون کا حوالہ دینا شروع کیا اور دعویٰ کیا کہ ان کا بچ رہنے والا سب سے چھوٹا بیٹا پوتے کے مقابلے میں وراثت کا حق دار ٹھہرتا ہے۔ مگر وائسرائے میرے والد کا مخالف تھا اور اس نے علی گڑھ کے معاملے کا سارا کچا چٹھا جمع کر رکھا تھا۔ اس کے برعکس حکومت کے کچھ ہمدرد اعلیٰ افسران جانتے تھے کہ دوسرے نوجوان لڑکے حکمران بننے کے قابل نہیں تھے اس لیے کہ وہ تعلیم یافتہ نہیں، بالکل وحشی تھے۔ حتمی فیصلے کے لیے مقدمہ جب لارڈ ریڈنگ کے روبرو پیش ہوا تو اس نے لکھا، 'ان کے برطانیہ مخالف رجحانات کی بنا پر کسی بھی حالت میں برطانوی حکومت حمید اللہ خان کو دوسری سب سے بڑی مسلم ریاست کے حکمران کے حیثیت سے برداشت نہیں کر سکتی'۔ جب میری دادی کو احساس ہو گیا کہ وہ مقدمہ ہارنے والی ہیں تو انھوں نے فوراً انگلستان جانے اور پریوی کاؤنسل کو اپیل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ ۱۹۲۵ء کی بات ہے۔ ہم سب، یعنی دادی اماں، والد، والدہ، میری بہنیں اور میں اکٹھے لندن پہنچے اور ایک بہت اچھے مکان ۲۹ پورٹ مین اسکوائر میں مقیم ہوئے۔ اور یہ پہلا موقع تھا جب ہم سب کو حقیقی آزادی نصیب ہوئی تھی اس لیے کہ 'سرکار اماں' جیسا کہ ہم سب اپنی دادی کو پکارتے تھے، آج کل خود بہت مصروف تھیں۔ اب ہم چپکے چپکے سینما جا سکتے تھے۔ بھوپال میں ہمیں جس کی اجازت نہ تھی۔ بمبئی کے گورنر کی اہلیہ لیڈی ولنگٹن نے تو سرکار اماں کو خود اس بات پر راضی کر لیا تھا کہ وہ چارلی چپلن کی فلم 'The Gold Rush' دیکھنے جائیں اس لیے کہ اس میں محبت وغیرہ کے ایسے مناظر نہیں جو ان کے مذہبی احساسات کے خلاف ہوں۔ ان کو وہ فلم پسند آئی اور یوں ایک بار ہی نہیں دوسری بار بھی دیکھی گئی۔

''جی ہاں! وہ لندن میں بہت مصروف رہیں، پریوی کاؤنسل کے ارکان سے بھی اور شہنشاہ جارج سے بھی ملیں۔ انھوں نے دلیلیں دیں، چلائیں، روئیں، حتیٰ کہ شہنشاہ کے سامنے بے ہوش بھی ہو گئیں۔ وہ برابر بھوپال اور برطانوی ہند کے مابین معاہدے کی نویں شق کا حوالہ دیتی رہیں جس کے مطابق وہ بھوپال کے داخلی معاملات میں دخل نہیں دیں گے۔ اور وہ بار بار یہی دلیل دیتیں کہ برطانیہ کو بھوپال کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی کرنے کا حق نہیں ہے۔ بالآخر نتیجہ ہی سب کچھ ہوتا ہے کے مصداق، انھوں وہ کچھ مل گیا ہے جو وہ چاہتی تھیں، میرے والد کو ولی عہد مان لیا گیا۔ اس دوران، آٹھ دس ماہ کے وقفے میں، میرے چچازادوں نے بھوپال میں میرے والد کو قتل کرنے کی کئی کوششیں کیں۔ یہ ہندوستان کے حکمران خاندانوں میں بہت عام سی بات تھی۔ اس لیے جو کچھ سرکار اماں نے کیا یہ ویسی ہی دوراندیشی کا کام تھا جتنی کہ وہ زیرک تھیں۔ جوں ہی ان کو تحریری فیصلہ ملا کہ برطانوی حکومت نے حمید اللہ خاں کو ریاست بھوپال کا ولی عہد تسلیم کر لیا ہے، انھوں نے نوابی سے دست برداری کا علان کر دیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ انھوں نے رات کے تین بجے، یہیں لندن میں، نوابی سے دست برداری کا اعلان کیا تھا۔ فوراً برطانوی حکومت کے نام ایک خط لکھا گیا تھا اور بھوپال اور ہندوستان میں برطانیہ کی حکومت کو تار ارسال کر دیے گئے تھے۔ انھوں نے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا اس لیے کہ اگر وہ یہ قدم نہ اٹھاتیں تو، انھیں پورا یقین تھا کہ میرے والد قتل کر دیے جاتے۔

''ہم سب بہت خوش تھے۔ میری عمر بارہ برس کی تھی اور میں بہت زیادہ پُرجوش نہیں تھی۔ ہم اس وقت تک ومبلڈن منتقل ہو گئے تھے اس لیے کہ پورٹ مین اسکوائر کی لیز ختم ہو گئی تھی۔ جیسا کہ میں نے کہا ہے، ہم سب ایک ساتھ تھے اس لیے کہ میری دادی نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر وہ اپنے مقدمہ ہار جاتیں تو وہ بھوپال واپس نہ جاتیں۔ بہر حال میرے والد ولی عہد بن چکے تھے اور چند ہی گھنٹوں بعد وہ حاکم بھی بن گئے اس لیے کہ میری دادی حکمرانی سے دست بردار ہو گئی تھیں جس کی وجہ سے انگریز سرکار بہت ناخوش تھی۔ حکومت نے یہ الزام دھرا

کہ انھوں نے اپنے اصل ارادے سے آگاہ نہیں کیا تھا مگر ان کا کہنا یہ تھا وہ کسی بھی حالت میں ایسا نہیں کر سکتی تھیں۔ ان کی اولاد میں سے صرف ایک باقی رہ گئی تھی اور وہ کسی بھی حالت میں ان کی زندگی کی بازی نہیں لگا سکتی تھیں جو ان کے مطابق بہت خطرے میں تھی۔ بالآخر برطانویوں نے ہتھیار ڈال دیے مگر ان کا یہ اصرار تھا کہ پچھلے ولی عہد کے بیٹے، یعنی میرے عم زاد، کو میرے والد کا ولی عہد نامزد کیا جائے۔ ان کا کہنا تھا کہ چوں کہ میرے والد کے کوئی اولادِ نرینہ نہیں تھی اس لیے ریاست کی بہتری کی خاطر ان کا بھتیجا ان کا ولی عہد بنے۔ میری دادی نے پھر ایک ماہر جنگجو کی طرح لڑائی لڑی اور کامیابی کے بعد ہی میدان سے ہٹیں۔ سرکاری طور پر میں ولی عہد بن چکی تھی۔''

ہشت پہل خاتون شہزادی عابدہ سلطان مسکرائیں اور ان کی مسکراہٹ صاف کہہ رہی تھی کہ ان کو اپنی دادی کی، جنھوں نے انھیں بیٹی کی طرح پالا تھا، بہادری کی داستان سنانے میں بہت لطف آرہا تھا۔ انھوں نے کہا، ''میری والدہ کو مجھ سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ میری دادی کی دو لڑکیاں وفات پا چکی تھیں اس لیے جب میں پیدا ہوئی تو انھوں نے مجھے گود میں اُٹھا لیا اور سیدھے اپنے کمرے میں لے گئیں اور میں وہاں سے سترہ برس بعد نکلی جب 'سرکار اماں' کا انتقال ہو گیا تھا۔ میں ان کی چہیتی تھی۔ میرے اس طرح لے جانے سے مراد کوئی جبر یا ظلم نہیں تھا۔ ان کے دل میں ایک طرح کا ملال تھا کہ انھیں کسی لڑکی کو اپنی طرح ڈھالنے کا موقع نہیں ملا کہ وہ ایک معیاری مسلمان عورت کی مثال بن سکے۔ اور ان ہی کی طرح، مجھے پردہ کرنے پر کبھی مجبور نہیں کیا گیا۔''

جب ہم سب ۱۹۶۲ء میں ہندوستان واپس پہنچے تو زندگی میں ایک طرح کی تبدیلی آ گئی تھی۔ چوں کہ شہزادی عابدہ کے والد نئے حاکم کے طور پر واپس آرہے تھے، جن کے حق میں 'سرکار اماں' حکمرانی سے دست بردار ہو چکی تھیں، اس لیے حفظِ مراتب کا خیال رکھا جا رہا تھا اور بہت آؤ بھگت ہو رہی تھی۔ ''ہم تین لڑکیاں میری والدہ اور میری دادی، سب ایک قسم کے جلوس کی صورت میں چلنے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ اچانک میری دادی نے فیصلہ کیا کہ چوں کہ میں اب (تیرہ برس کی ہو کر) بالغ ہو چکی تھی اس لیے مجھے پردے میں جانا ہوگا۔ یہ سن کر مجھے دھچکا لگا مگر مجھے برداشت کرنا پڑا۔ مگر زیادہ دنوں تک مجھے پردے میں نہیں رکھا جا سکا۔ میں نے بغاوت شروع کی اور آنکھ مچولی کھیلنے لگی۔ جوں ہی میری دادی آنکھوں سے اوجھل ہوتیں، میں وہی کچھ کرنے کے لیے غائب ہو جاتی، جو میں ولی عہد بننے سے پہلے کیا کرتی تھی، یعنی، باہر نکلنا، پولو کھیلنا، گھڑ سواری کرنا وغیرہ۔ ایک دن میری دادی کہیں جا رہی تھیں کہ ان سے میری مڈ بھیڑ ہو گئی، مجھے بغیر برقعے کے کار چلاتا دیکھ کر وہ آگ بگولا ہو گئیں۔ انھوں نے فوراً میرے والد کو، جو اب حاکم تھے، بُلا بھیجا اور اصرار کر کے انھیں اس بات پر راضی کر لیا کہ نہ صرف میں بلکہ خاندان کی تمام عورتیں پردہ کرنا چھوڑ دیں۔ ہم لوگ بہت خوش اور اپنے والد کے شکر گزار ہوئے۔''

شہزادی عابدہ نے جب از راہِ مہربانی مجھے گفتگو کے لیے بلایا تھا، جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں، وہ اپنی ٹانگ کے ٹوٹ جانے کی وجہ سے بستر پر دراز تھیں۔ میں نے ان کے بارے میں بہت کچھ سُن رکھا تھا کہ وہ پہلی ہندوستانی عورت تھیں جنھیں ہوابازی کا لائسنس مل چکا تھا، وہ عورت جس کی کسی بھی کار کو کبھی کسی مستری نے ہاتھ نہیں لگایا تھا اس لیے کہ وہ آج بھی خود اپنے ہاتھوں ان کی مرمت اور دیکھ بھال کیا کرتی تھیں۔ یہ تھی وہ ماضیِ بعید کی نہایت شائستہ اور کمیاب نوع کی تجسیم، تاریخ کی ایک زندہ مثال، اور اس کے باوجود نہایت زیرک، بڑی باعمل اور اعلیٰ درجے کی آزاد خاتون۔ ان کی جانب نظر کرنے سے پہلے ہی جس چیز پر میری نظر پڑی تھی وہ دو عدد اعلیٰ درجے کی خوف ناک رائفلیں تھیں، ان میں سے ایک ان کے پاس تھی۔ ابتدائی آداب و تسلیمات کے بعد انھوں نے مجھے بتایا کہ یہ بندوقیں، دکھاوے کے لیے نہیں، اصلی ہیں۔ یہ بھی کہ کچھ دن پہلے ہی انھوں نے ایک چور کو بھگانے کے لیے چلائی تھی جو ان کے گھر میں گھس آیا تھا۔

''ہم سب بندوقوں کے سائے میں پلے بڑھے تھے، یہ ہماری روایت تھی۔ جب میں اور میری بہنیں پیدا ہوئیں تھیں، پیدائش سے قبل ایک گھوڑا تیار کھڑا ہوتا تھا اور پیدائش کے فوراً بعد نوزائیدہ کو پالنے میں ڈال کر گھوڑے کی پشت پر رکھ دیا جاتا تھا۔ یہ ہمارے خاندان کی روایت تھی۔ اس سے مطلب نہیں کہ نوزائیدہ لڑکا تھا یا لڑکی۔ جنسی اعتبار سے کوئی تفریق نہیں کی جاتی تھی۔ کیوں نہ ہو، ہماری ریاست پر چار

عورتوں نے ،ایک کے بعد ایک، ۱۰۸ر برس حکمرانی کی تھی۔"

بیٹی اور نوجوان شہزادی عابدہ کو اپنے والد پر بڑا فخر رہا ہوگا اور میرے خیال میں وہ اپنے باپ سے بہت قریب تھیں۔ جس انداز میں وہ اپنے والد کا ذکر کرتی تھیں اس سے لگتا تھا کہ وہ بہت خیال کرنے والے باپ، خوب رو، ذہانت کی کشش رکھنے والے اور اعلیٰ درجے کے شکاری تھے۔ وہ ہاکی کے بہت اچھے کھلاڑی، ہندوستان میں پولو کے سب سے اچھے کھلاڑی اور اعلیٰ درجے کے نشانے باز بھی تھے۔ ہندوستان کے دوسرے بہت سے شہزادوں کے برعکس ہندوستان کی سیاست میں وہ گہری دل چسپی لیتے تھے۔ ان کی خوش قسمتی تھی کہ انھیں ہندوستان میں اس وقت کے بہترین دماغوں سے قربت کے مواقع حاصل رہے تھے۔

حمید اللہ خان نے خود کو بہت خوش قسمت سمجھا ہوگا کہ، اپنے دوسرے بھائیوں کے مقابلے میں، انھیں چالیس برس تک ایک عام انسان جیسی زندگی نصیب ہوئی۔ اگر ولی عہدی کا ذرا بھی شائبہ ہوتا تو انھیں علی گڑھ جانا کبھی نصیب نہیں ہوتا۔ اور انھیں ایسے دوست بھی نصیب نہیں ہوتے جنھوں نے، ان کے حاکم بن جانے کے بعد، نہ صرف ان کی زندگی میں بلکہ ریاست کے اہم مناصب پر رہ کر بھوپال کے لیے بہت کام کیے تھے۔

بہت ممتاز لوگ، جنھوں نے پاکستان کے قیام کے بعد نئی مملکت اور اس کی ترقی کے لیے نمایاں کام کیے۔ پاکستان کے تیسرے گورنر جنرل، غلام محمد کے طویل عرصے کے دوست اور ساتھی شعیب قریشی، عبدالرحمٰن صدیقی، طویل عرصے تک رہنے والے پاکستان کے وزیرِ خارجہ اور اقوامِ متحدہ میں اس کے مندوب چودھری محمد ظفر اللہ خاں ان لوگوں میں سے تھے جو مل کر 'Round Table of the Nawab's Court at Camelot' بن گئے تھے۔

ان میں سے زیادہ تر انگلستان میں اپنے قیام کے دوران قریبی دوست تھے، جب کہ کچھ تو علی گڑھ ہی سے دوست بن گئے تھے۔ وہ سب اس بات پر متفق تھے کہ جتنی جلد ہو سکے برطانیہ کا راج ختم ہونا چاہیے حالاں کہ ان میں کسی کو بھی ان کے اندازِ زندگی سے اختلاف نہیں تھا۔ اس کے برعکس، ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقے کی طرح وہ انگلستان کو اپنی عقلی و ذہنی پناہ گاہ سمجھتے تھے اور وہاں کے سیاسی اداروں اور معاشرتی نظام کو اپنے ملک میں رائج کرنے کے قابل سمجھتے تھے۔ انگلستان میں نواب صاحب بھوپال اور ان کے دوستوں نے معاشی میدان میں مسلمانوں کے عملی طور پر شریک ہونے کے بارے میں تبادلۂ خیال کیا۔ اور جوں ہی مسلمانوں کی ملکیت میں ایک بیمہ کمپنی کی تشکیل کا خیال پیش کیا گیا تو انھوں نے فوراً اس کے لیے مالی مدد فراہم کرنے کا وعدہ کیا اور جب ۱۹۳۲ء میں کلکتے میں ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی کی بنیاد پڑی تو اس کا سرپرست ہونا قبول کر لیا جب کہ دوسرے سرپرست آغا خان بنے۔

جن لوگوں کا ابھی تذکرہ کیا گیا ان کے، یا علی برادران کی طرح، ایک اور انسان ڈاکٹر انصاری تھے جو خلافت تحریک کے دوران مشہور طبّی وفد لے کر ترکی گئے تھے، عقلی اعتبار سے ایک نابغۂ روزگار راجا صاحب محمود آباد، یا چودھری خلیق الزماں، یہ سب اپنے انداز میں نواب حمید اللہ خاں پر اثر انداز ہوئے ہوں گے جو گویا خود تار پر چلنے کے ماہر تھے۔ تار پر چلنے کے ماہر اس لیے کہ وہ دو مختلف دنیاؤں کے درمیان چلتے رہتے اور ہر جگہ خوش آمدید کہے جاتے، اور یہ کوئی آسان بات نہ تھی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نواب صاحب بڑی صلاحیتوں کے مالک تھے اور دونوں جانب سے اٹھنے والے بڑے سے بڑے مشکل حالات میں کامیاب رہتے تھے۔ جب پرنس آف ویلز ہندوستان تشریف لائے تھے تو نواب صاحب ان کے اے ڈی سی کی حیثیت سے ان کے ساتھ ساتھ رہے۔ ان کو اس بات پر بجا طور پر بڑا فخر تھا کہ انھوں نے مہمان برطانوی شہزادے کو پولو کے کھیل میں، ان کی ماں کی موجودگی میں اور حد درجہ شرمندگی کے باوجود، شکست دی۔ وہ براہِ راست ہندوستان کی تحریکِ آزادی کے فعال کارکن رہے، چانسلر کی حیثیت سے ۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۲ء میں ہونے والی گول میز کانفرنس میں ہندوستانی شہزادوں کے چیمبر کی نمائندگی کی اور ان کی جانب سے ۱۹۴۴ء سے ۱۹۴۷ء تک مذاکرات اور معاملات طے کیے۔ ان سب کے

لیے غیر معمولی ذہانت، لچک، ہمت اور خود اعتمادی کی ضرورت ہوتی ہے جو بہ ظاہر نواب صاحب میں وافر مقدار میں موجود تھی۔

شہزادی عابدہ کو گول میز کانفرنس کے سلسلے میں متعدد بار لندن کا سفر اچھی طرح یاد ہے۔ جناب عمر خان سے اپنی ایک گفتگو میں انھوں نے بتایا تھا کہ ''ان دنوں امیدیں بہت تھیں اور در حقیقت لوگوں کو یقین نہیں تھا کہ انگریز کبھی ہندوستان کو چھوڑیں گے۔ پھر بھی ان کا خیال تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو کسی قسم کی نمائندگی دینے کا کوئی نسخہ نکالا جائے گے تا کہ لوگ مطمئن ہو جائیں۔ مجھے یاد ہے کہ میں موتی لال نہرو سے، جب وہ بھی گول میز کانفرنس کے سلسلے میں لندن جارہے تھے، ملی تھی اور پہلی ہی ملاقات میں ان کی گرویدہ ہوگئی تھی۔ وہ بہت نفیس انسان تھے۔''

یہ سب انھوں نے ہماری ملاقات کے دوران بتایا تھا، اور یہ بھی کہا تھا کہ وہ مہاتما گاندھی کو بالکل پسند نہیں کرتی تھیں۔ وہ بھی اس جہاز پر تھے جس پر ہندوستان کے دوسرے نمائندے، جناح، موتی لال نہرو اور ان کے بیٹے جواہر لال، آزاد اور گاندھی وغیرہ سفر کر رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کی وہ ان سب سے ملی تھیں۔ اور جب میں نے ان سے استفسار کیا کہ مہاتما ان کو کیوں پسند نہیں آئے، جن کو ہندوستان کی اکثریت پسند کرتی تھی تو انھوں نے کہا، ''سب سے پہلی بات تو یہ تھی کہ میرے خیال میں وہ ریاکار انسان تھے۔ اس لیے کہ خود کو مسلمانوں کا ہم درد جتانے کے لیے روزانہ قرآن کی آیات پڑھتے تھے۔ پھر وہ سب کو برابر سمجھنے اور لوگوں میں کسی قسم کی تفریق نہ کرنے کا ڈھکوسلا کرتے تھے، کہ ان کی نظر میں سب برابر تھے۔ مگر ان کے بارے میں میرا پہلا تاثر ایک ایسے انسان کا تھا جس کے لیے اتنی ہنگامہ خیزی کی جاتی تھی، اور ان کے گرد اخبار والے اس بات پر ان کی تعریف میں رطب اللسان رہتے تھے کہ وہ تیسرے درجے میں سفر کر رہے تھے۔ اور پھر مجھے احساس ہوا کہ اچھا وہ تیسرے درجے میں سفر کر رہے ہیں، مگر تیسرے درجے کا پورا عرشہ ان کے لیے خالی کرا لیا گیا تھا اور سارے مسافروں کو نیچے کے تہہ خانے میں منتقل کر دیا گیا تھا جہاں وہ اپنا کھانا بھی پکاتے تھے۔ یہ سب کچھ بے پناہ گرمی کے عالم میں تھا کہ جہاں تازہ ہوا کا گزر نہ تھا۔ اور ان کو اوپری عرشے پر جانے کی اجازت نہ تھی۔ اور وہاں وہ، جنابِ گاندھی، پورے عرشے پر تنِ تنہا براجمان رہتے۔ یہ سب کچھ آخر ڈراما نہیں تو اور کیا تھا۔ ان کا خدا اس بارے میں کیا سوچتا رہا ہوگا؟''

''پیٹرک فرنچ نے اپنی خوب صورت کتاب 'Liberty or Death'، میں لکھا ہے کہ 'گاندھی کے اندازِ حیات میں بہت تضاد تھا۔ وہ غربت کے خلاف جنگ آزما تھے، جدید صنعت کاری کی مذمت کرتے تھے پھر بھی برلا، سبھا والوں اور بجاج خاندان کے بڑے مسرف عطیات پر انحصار کرتے تھے جن کی تمام دولت اسی سے پیدا ہوتی تھی۔ وہ ہمیشہ اپنے چیلوں کے ہجوم کے ساتھ سفر کرتے تھے جو دوسروں سے بے حد نخوت اور سرد مہری سے پیش آنے کے لیے مشہور تھے۔ اس کے باوجود مہاتما خصوصی برتاؤ کے خلاف ہونے کے دعوے کرتے تھے۔ وہ ہندوستان کی دیہی آبادی کی طرح رہنا پسند کرتے تھے مگر وہ جہاں کہیں بھی جاتے، جڑی بوٹیوں، ترکاریوں اور خصی بکروں کا انبار لگا دیا جاتا، عمارتیں رگڑ رگڑ کر صاف کی جاتیں، سفیدی اور سجاوٹ کی جاتی، اور مٹی کو ریفریجریٹر میں رکھ کر ٹھنڈا کیا جاتا جس کو مہاتما 'فطری علاج' کی غرض سے اپنے پیٹ پر ملتے تھے۔ ان کے مخالف محمد علی جناح کہتے تھے کہ وہ اوّل درجے میں سفر کرنے کے باوجود ریل کے کرائے کی مد میں گاندھی سے کم رقم خرچ کرتے تھے، اس لیے کہ وہ صرف ایک ہی ٹکٹ خریدتے تھے۔''

نواب صاحب کی ذاتی زندگی کے بارے میں زیادہ معلومات مہیا نہیں۔ کے ایف حیدر جیسے ان کے قریبی دوستوں کے مطابق، جو اُن کے رازداں بھی تھے، وہ بہت سخی تھے اور خوش گوار شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک ایسے انسان کہے جاتے ہیں جس کو اپنی رعایا کا بہت خیال رہتا تھا اور جو خوب جانتے تھے کہ ان کی ریاست کے عوام کے لیے تعلیم کی بہترین سہولت بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اور یہ پڑھ کر کہ نواب صاحب کو 'Round Table at His Court of Camelot' کے اطراف ملک کی بہترین شخصیات کو اکٹھا کرنے میں ملکہ حاصل تھا، میرے قاری یہ جان کر حیران نہیں ہوں گے کہ سر سیّد احمد خاں کے فرزند سر سیّد راس مسعود، جو ایک مشہور ماہرِ تعلیم تھے، ان کی

ریاست میں تعلیم کے وزیر کی حیثیت سے کام کر چکے تھے۔ اور جب وہ بھوپال میں تھے، انھوں نے ڈاکٹر سر اقبال کو وہاں آنے اور اپنے پاس کچھ دن قیام کرنے کی دعوت دی تھی اور اس عظیم فلسفی کے لیے پانچ سو روپے کی ماہانہ پنشن کا انتظام بھی کیا تھا۔ اس کے علاوہ نواب صاحب نے شاعر کے علاج کا خرچ بھی برداشت کیا تھا۔

نواب صاحب کے پاکستان موافق سیاسی نظریات سب کو معلوم تھے۔ بہت ابتدائی مرحلے پر ہی انھوں نے پاکستان کی تحریک کی حمایت کی تھی۔ اس کے باوجود 'چیمبر آف پرنسز' کی جانب سے ہندوستان کی آزادی کی صورت میں رجواڑوں اور نوابوں کے لیے زیادہ سے زیادہ خودمختاری کے لیے دلائل دیے تھے اور سائمن رپورٹ کے مطابق ایک 'پریوی کونسل' کے قیام کی تجویز پیش کی تھی۔ وہ مرکز میں ایک ڈھیلی ڈھالی فیڈریشن کے حق میں تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ ہندوستانی حکومت کو 'برطانوی فرماں روائی' منتقل کی جائے۔

جوں ہی لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جون ۱۹۴۷ء میں اقتدار کی منتقلی کے برطانوی منصوبے کا اعلان کیا، انھوں نے 'چیمبر آف پرنسز' کے چانسلر کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ وہ چاہتے تھے کہ بھوپال کو خودمختار حیثیت ملے اور اندور کے مہاراجا کے ساتھ مل کر انھوں نے ایک گروپ کی سربراہی کی جو ریاستوں کے الحاق کے خلاف تھا۔ انھوں نے ۲۵ر جولائی ۱۹۴۷ء کو سارے حکمرانوں کے اجتماع میں شرکت سے انکار کر دیا جس سے ان کے بچپنے کے دوست وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن خطاب کرنے والے تھے۔ انھوں نے کھلم کھلا شکایت کی کہ ریاستوں کے حکمرانوں کو Walrus اور Carpenter کی سیپیوں کی طرح دعوت دی جارہی ہے (یہاں ایک شاعر Lewis Carroll کی ایک نظم کنائے کے طور پر استعمال کی گئی ہے۔ یہ نظم ۱۸۷۱ء میں اس کے مجموعے Through the Looking Glass میں شائع ہوئی تھی جو بچوں کے ادب پر مشتمل تھی۔ اس نظم میں دو کردار والرس اور کارپینٹر ایک شب ساحل کے کنارے ٹہل رہے تھے کہ ان کی چند سیپیوں سے ملاقات ہوگئی۔ انھوں نے چار بڑی سیپیوں کو اپنے ساتھ تفریح کی دعوت دی۔ سب سے عمر رسیدہ سیپ کی مخالفت کے باوجود بہت سی سیپیاں ہمراہ ہولیں۔ ساحل کے کنارے چلتے چلتے دونوں کرداروں Walrus اور Carpenter کو بھوک لگتی ہے اور وہ مل کر ساری سیپیوں کو چٹ کر جاتے ہیں۔ بعد میں Walrus کو اپنے کیے پر پچھتاوا ہوتا ہے اور وہ رونے لگتا ہے۔ مترجم) حالاں کہ نواب صاحب کو مختلف انتظامی طریقوں سے رام کرنے کی کوشش کی گئی تھی مگر وہ اپنے بچپن کے دوست، وائسرائے کے ذاتی اصرار کے باوجود اپنے اقدام پر اڑے رہے۔

وائسرائے نے لکھا، ''میرے خیال کے مطابق میں نے مجموعی طور پر اوروں کے مقابلے میں بھوپال کے معاملے پر بہت وقت صرف کیا ہے کہ نواب بہت مسحور کن اور بلند اصولوں والی شخصیت ہیں اور یہ بڑا سانحہ ہوگا اگر اس وقت شرکت نہ کر کے وہ اپنی ریاست کو تباہ کر دیں گے۔''

کہا جاتا ہے کہ دو دن قبل ہی لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی نواب صاحب سے کافی طویل گفتگو ہوئی تھی جس میں انھوں نے اپنی بیٹی کے حق میں دست برداری کی دھمکی دی تھی۔ ماؤنٹ بیٹن لکھتے ہیں کہ ''میں نے ان سے کہہ دیا کہ میں اس کو ایک بزدلانہ عمل جانتا ہوں اور یہ ان کی بیٹی کے حق میں غیر منصفانہ ہوگا اور یہ بھی کہ ان کو کم از کم ایک برس تک ریاست کی حکمرانی کرنی چاہیے..... اگر اس کو ٹال سکا تو میں نہیں سمجھتا کہ میں انھیں حکمرانی سے دست برداری کی اجازت دوں گا، اس لیے کہ بادی النظر میں ایسا لگے گا گویا ان پر جبر کیا جارہا ہے، جب کہ ایسا ہرگز نہیں ہے، جس کا پہلے وہ خود اعتراف کر چکے ہیں۔''

یہ دیکھ کر کہ حکمرانوں کی اکثریت الحاق کر رہی ہے، نواب صاحب کے قدم ڈگمگا گئے۔ انھوں نے الحاق کیے بغیر ایک 'توقفی معاہدے' کے لیے کہا مگر ان کو نفی میں جواب ملا۔ پھر انھوں نے اپنے آئینی مشیر سر ظفر اللہ خان کو الحاق کی دستاویز پر بات چیت کے لیے بھیجا مگر ان کو بھی یہی جواب ملا کہ انھیں کوئی خصوصی شرائط نہیں ملیں گی۔ انھوں نے بالآخر دستاویز پر دستخط کر دیے اس شرط پر کہ انتقالِ اقتدار کے دس دن گزرنے تک اس کو خفیہ رکھا جائے گا۔ اپریل ۱۹۴۸ء میں بھوپال میں ایک عبوری حکومت بنائی گئی اور جون ۱۹۴۹ء میں بھوپال کو چیف

کمشنری کا صوبہ بنا دیا گیا۔ اس طرح مرکزی ایشیا کی دوسری سب سے بڑی مسلم ریاست کی خود مختاری اپنے انجام کو پہنچی۔ ۱۹۵۶ء میں ریاستوں کی تنظیم نو کے بعد ریاست بھوپال مدھیہ پردیش میں ضم ہوگئی اور بھوپال شہر صوبے کا صدر مقام بنا دیا گیا۔

اس انضمام پر مجھے ۱۹۹۹ء کا ایک دل چسپ واقعہ یاد آیا، جب میں ہندوستان گیا ہوا تھا۔ ہندوستان کے ایک سابق صدر شنکر دیال شرما کا انھیں دنوں انتقال ہوا تھا اور ایک تعزیتی پیغام میں، جو میں نے انڈین ایئر لائنز کی پرواز پر ملنے والے کسی اخبار میں پڑھا تھا، لکھا ہوا تھا کہ آنجہانی بھوپال میں ایک سنسکرت کے عالم کے گھر پیدا ہوئے تھے۔ ظاہر ہے کہ شرما بہت قابل رہے ہوں گے اور انھوں نے شروع ہی سے اپنی تعلیمی زندگی میں محنت کی ہوگی۔ ان کی اعلیٰ تعلیم آگرے میں اور اس کے بعد الٰہ آباد یونی ورسٹی میں ہوئی تھی جہاں سے انھوں نے انگریزی میں ایم اے اور ایل ایل بی کیا تھا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد وہ کیمبرج گئے، ایک برس ہارورڈ میں پڑھے اور لنکنز اِن سے بیرسٹر فارغ التحصیل ہوئے۔ اس برس ہندوستان واپسی پر شرما جی نے ایک مظاہرے میں حصہ لیا جو نواب بھوپال کے خلاف ہو رہا تھا جس میں بھوپال کو ہندوستان میں ضم کرنے کی مانگ کی جا رہی تھی۔ اس مظاہرے میں شرما جی نے نواب بھوپال پر غداری کا الزام لگایا اور جلسے کے اختتام پر ان کو گرفتار کر کے آٹھ ماہ کے لیے جیل میں ڈال دیا گیا۔ بھوپال کے ہندوستان میں انضمام کے بعد ان کو رہائی ملی اور وہ تدریس کی غرض سے لکھنؤ یونی ورسٹی سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۹۵۲ء میں ریاست کے سابقہ قیدی چیف منسٹر کی حیثیت سے اپنے گھر واپس ہوئے اور یہ عہدہ اُس وقت تک ان ہی کے پاس رہا جب بھوپال کو نئے بنائے جانے والے صوبے مدھیہ پردیش میں ضم کر دیا گیا۔

ظاہر ہے کہ وقت کے گزر جانے کے باعث میرے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ میں مرحوم نواب صاحب سے اُن کی رعایا کے ایک فرد کی عالی شان ترقی کے بارے میں ان کے خیالات دریافت کر سکتا۔ مگر میں تصوّر کر سکتا ہوں کہ انھیں اس بات پر بہت فخر رہا ہوگا۔

بھوپال کے حکمران کی ولی عہد شہزادی عابدہ سلطان کے روبرو کراچی، پاکستان میں بیٹھے ہوئے اور یہ جانتے ہوئے کہ انھوں نے بڑے امتیاز سے اس ملک کے لیے سفارتی خدمات انجام دی ہیں، میں یہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا کہ نواب صاحب نے تقسیم اور ریاست کے ہندوستان سے الحاق کے بعد پاکستان ہجرت کے بارے میں کیوں نہیں سوچا۔ بالخصوص اس لیے کہ اس ملک کی تخلیق میں اور اس کو ہندوستان کے مسلمانوں کا گھر بنانے میں انھوں نے بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔

شہزادی نے کافی دیر سوچ کر جواب دیا کہ ''جہاں تک میری ذات کا سوال تھا میں ۱۹۴۷ء سے کافی پہلے ہی بیگم محمد علی (مولانا محمد علی کی اہلیہ) کے ساتھ پاکستانی بن چکی تھی جب اس کی تشکیل بھی نہیں ہوئی تھی۔ میں بیگم محمد علی کے قصوں اور ان کے تصورات کے زیر اثر مکمل طور پر پاکستان کے لیے وقف ہو چکی تھی۔ ایک تو میں بہت مذہبی تھی اور اس پر مستزاد یہ کہ میرے خیال میں پاکستان ایک بڑا بھوپال، مگر اس جیسا ہی ہوگا۔ یہ کبھی میرے وہم و گمان میں بھی نہیں آیا تھا کہ اس ملک کے کچھ لوگ اس کو مذہبی ریاست بنانا چاہتے ہیں۔ بلا شبہ جناح صاحب نے کبھی ایسا نہیں چاہا تھا۔ اور میرے والد بچپن سے میرے لیے نمونہ تھے۔ انھوں نے پاکستان میں جائیدادیں خریدی تھیں اور وہ یہاں آنے والے تھے۔ پھر میرے شوہر نے پاکستان میں جائیدادیں خریدیں۔ وہ سب یہاں آنے والے تھے یا صرف آنے کا ارادہ ظاہر کر رہے تھے۔ مگر دونوں یہاں نہیں آئے۔ ہندوستان جاتے ہوئے میرے والد کچھ بار پاکستان سے ہو کر گزرے اور دو ایک دن قیام بھی کیا تھا۔ مگر وہ کبھی نہیں آئے، اس وقت بھی جب جناح صاحب کے انتقال کے بعد یہاں کے تمام اخباروں میں ان کے گورنر جنرل بننے کے بارے میں قیاس آرائیاں کی جا رہی تھیں۔ مجھے بالکل نہیں معلوم کہ انھیں کس بات نے یہاں آنے سے روکا تھا۔ مجھے کہانیاں گھڑنی نہیں آتیں، نہ مجھے اس قسم کی باتوں کی عادت ہے۔ اور جو جائیدادیں انھوں نے خریدیں تھیں وہ اب بھی موجود ہیں۔ اسی طرح میرے شوہر کی خریدی ہوئی جائیدادیں بھی موجود ہیں۔ مگر وہ لوگ آئے ہی نہیں۔ پھر انھوں نے یہ جائیدادیں کیوں خریدی تھیں؟ اس مکان سے متصل جس میں کبھی جناح صاحب نے قیام کیا تھا، بھوپال ہاؤس موجود ہے۔ ساری دنیا میں خبریں اڑی تھیں کہ وہ آئیں گے مگر انھوں نے نہ آنے کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے

بالکل خبر نہیں، کیوں۔''

ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ شہزادی نے اپنے شوہر کا ذکر کیا۔ ان کا بھی تعلق اسی خانوادے سے تھا جس سے بھوپال کے حکمراں منسلک تھے۔ یعنی قربائی کے نواب۔ شہزادی عابدہ کی دادی نے ان کی شادی کرائی تھی اور ان کی والدہ کو اس بات پر راضی کر لیا تھا کہ ان کی باقاعدہ تعلیم اندور میں اور بعد میں Sandhurst میں ہو۔ ان دونوں کے ایک ہی فرزند ہیں، پاکستان کی وزارتِ خارجہ کے ایک بہت ہی محترم شخص۔ انھوں نے پاکستان کے لیے بہت سی سفارتی خدمات انجام دی ہیں۔ ان دنوں وہ پیرس میں پاکستان کے سفیر ہیں۔

شہزادی عابدہ نے مجھے بتایا کہ لڑکپن اور نوجوانی میں، ایک لڑکی ہوتے ہوئے کس طرح انھوں نے گھڑ سواری کی، پولو کھیلا، شیر چیتے شکار کیے اور صرف دس برس کی عمر میں وہ محل کے اطراف کے گڑھوں میں Daimler گاڑی کداتی پھرتی تھیں۔ اپنی دادی 'سرکار اماں' کا انھوں نے ایک بڑا محبت بھرا نقشہ کھینچا، اور اس شخصیت کا جو زندگی بھر ان کے لیے مشعلِ راہ رہی یعنی ان کے والد، بھوپال کے نواب کے بارے میں اس سادہ اور دل آویز انداز میں بیان کیا کہ ان سے رخصت ہونے کے بعد، ہوٹل جاتے ہوئے مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا میں نواب صاحب سے مل چکا ہوں، اور وہ کتنی بلند و بالا اور مضبوط قوتِ ارادی کے مالک رہے ہوں گے۔

میں نے سوچا کہ نواب صاحب کے لیے خود یہ کتنے دکھ کی بات رہی ہوگی کہ، جو کچھ بھی وجہ رہی ہو، وہ اُسی ملک کی بنیاد گزاری میں ہاتھ نہ بٹا سکے جس کی تشکیل کے لیے انھوں نے جد و جہد کی تھی۔ اور مجھے محسوس ہوا کہ یہ ایک ناقابلِ تلافی نقصان تھا، ایک ضائع ہونے والا موقع، یا دونوں۔

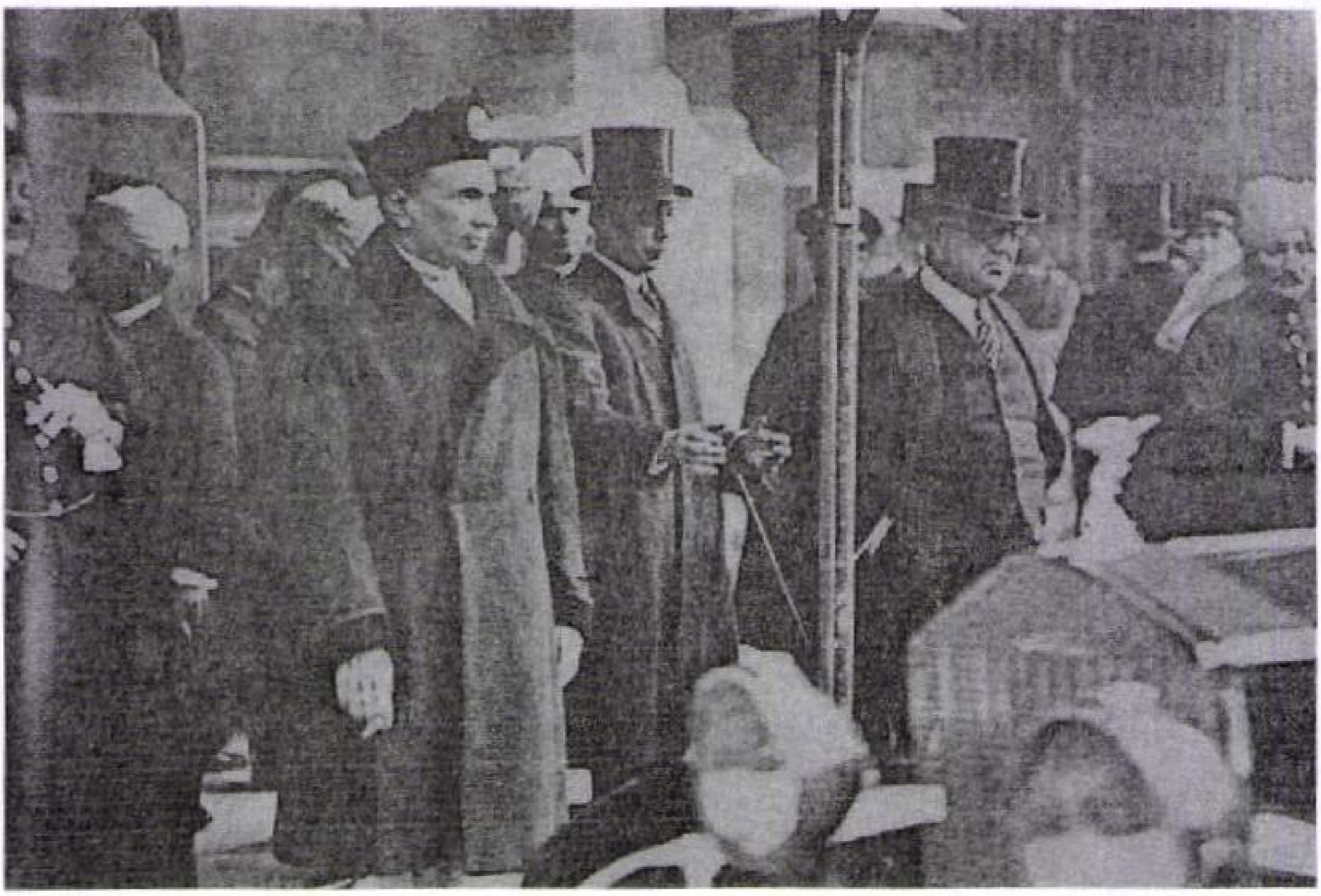

لندن میں ۱۹۳۰ء کی گول میز کانفرنس کے افتتاح کے بعد آغا خان ہاؤس آف لارڈز سے رخصت ہوتے ہوئے

عالی مرتبت آغا خان، انگلستان میں ۱۹۳۰ء کی ڈربی کے فاتحین کی قیادت کرتے ہوئے

بمبئی ۱۹۴۶ء میں ڈائمنڈ جوبلی کی تقریبات کے موقع پر آغا خان، اہلیہ اور پرنس صدرالدین کے ساتھ

عالی مرتبت آغا خان

ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی کے پہلے میزانیے (بیلنس شیٹ) میں جو ۱۹۳۲ء کے آخری تین مہینوں اور ۱۹۳۳ء کے پورے سال پر محیط تھا، ہندوستان کی دو شاہی شخصیتیں سرپرست کی حیثیت سے شامل تھیں: عالی مرتبت آغا خان اور عالی مرتبت نواب بھوپال۔ مجھے اس بات کا علم نہیں کہ اس مقام پر سرپرست کے لفظ سے کیا مراد تھا مگر میں یہی تصور کرسکتا ہوں، یہ عوام کو ایک اشارہ دینے کی کوشش تھی۔ ان کو یہ بتانے کی کوشش کہ اب ایک انشورنس کمپنی قائم ہوئی ہے جس کو مسلمانوں میں سے دو مشہور اور صاحبِ رسوخ شخصیتوں کی حمایت حاصل ہے۔ اور دوسری مسلم شاہی شخصیت، جو مسلمانوں میں سب سے زیادہ محترم اور سب سے زیادہ دولت مند تھی یعنی حضور نظام حیدرآباد کی شخصیت جو کم از کم بالواسطہ اس میں شریک تھی۔ نظام کی حکومت کے ایک اعلیٰ افسر بورڈ آف ڈائریکٹرز میں شامل تھے، اور بالائی سطور میں بیان کیے ہوئے دو سرپرستوں کے کارندے۔ ان تینوں نے کمپنی کے حصص بھی خریدے تھے اور اس طرح وہ اس نئے کاروبار پر اعتماد کرتے تھے جس کا مطلب یہ بھی تھا کہ اس ادارے کو مسلمانوں کی حمایت حاصل ہے، ہندوستان میں مسلم نشاۃ الثانیہ کی ایک عملی مثال۔

دوسری شاہی شخصیات کے برعکس نواب بھوپال ای ایف یو کی بنیاد گزاری میں براہِ راست شریک تھے۔ جب کہ دوسری دونوں شخصیتوں کو بھوپال کے برادرِ شاہی نے کمپنی میں حصہ لینے کے لیے مدعو کیا تھا۔

اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ ڈائریکٹران میں ان دونوں کے نمائندوں کی شمولیت ای ایف یو کے لیے بہت خوش آئند بات تھی اور اس کو کم اہمیت کی بات نہیں سمجھا جانا چاہیے۔ بیمے کی صنعت پر حاوی برطانوی اور دوسری غیر ملکی، اور ہندوؤں کی ملکیت چند ہندوستانی، کمپنیوں کے مقابلے میں ایک نئی مقامی کمپنی کو اس نوع کی مدد نے بہت سہارا دیا تھا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ ای ایف یو کے مؤسس بزرگ نہ صرف نواب صاحب بھوپال کی ذاتی دل چسپی اور شرکت پر بہت شکرگزار رہے ہوں گے بلکہ آغا خان اور نظام حیدرآباد کی سرپرستی اور حمایت پر بھی خواہ وہ بالواسطہ ہی کیوں نہ رہی ہو۔

آغا خان کی شمولیت اس لیے اور بھی اہم تھی کہ بیسویں صدی کی ابتدا سے ہندوستان کے مسلمانوں کے معاملات میں ان کا کردار نمایاں رہا تھا۔ بعد میں محمد علی جناح کی ہندوستان واپسی پر آل انڈیا مسلم کی تنظیم نو ہوئی اور ہندوستان کے مسلمانوں کی جذباتی بیداری اور ان کی بھرپور امداد نے اس ادارے کو اتنا طاقت ور اور فعال بنا دیا کہ بالآخر اس نے پاکستان کے قیام کے خواب کو پورا کردیا۔ آخر یہ آغا خان ہی تو تھے اکتوبر ۱۹۰۶ء میں جن کی قیادت میں ستر مسلمانوں کے مشہور وفد سے شملے کے وائسرائے محل کی رقص گاہ میں لارڈ منٹو نے ملاقات کی تھی۔ یہ وفد اپنے ساتھ ایک سپاس نامہ لے کر گیا تھا جس پر شہنشاہِ معظم کی مسلمان رعایا کی اشرافیہ، ریاستوں کے وزرا، جاگیردار، وکلا، تجار وغیرہ نے دستخط کیے تھے۔ اس وفد کو بڑی کامیابی ہوئی تھی جس کی بنیاد پر ہی مستقبل کے انتخابات میں علیٰحدہ نمائندگی دی گئی تھی۔ اس طرح

آغا خان بیسویں صدی کے پہلے پچیس برسوں کے عرصے میں ہندوستان کے غیر متنازعہ فیہ رہبر کے طور پر ابھرے۔ برِصغیر کے کونے کونے میں ان کی بات سنی جاتی تھی۔ ای ایف یو کے لیے ان کی سرپرستی کی قبولیت بے پایاں اہمیت کی حامل تھی۔

اس وقت مجھے ایسی کوئی ہستی نہیں ملی، اس کتاب کے سلسلے میں جس سے ان کے بارے میں معلومات حاصل کی جا سکتیں۔ نہ ہی میں نے موجودہ آغا خان کے اہلِ خاندان سے اس موضوع پر رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ اس لیے کہ اگر کوئی ملا بھی اور اس نے وقت بھی دیا تو بھلا اس کو ایک انشورنس کمپنی کے بارے میں اپنے دادا، پردادا کے احساسات کا کیا علم ہوگا جنھوں نے اس کمپنی کی تشکیل میں مدد کی تھی۔

اس میں شک نہیں کہ میں آغا خان مرحوم کا ہم عصر تھا۔ میرے ملک (جرمنی) میں وہ خاصے معروف تھے۔ جرمن اخباروں میں اکثر ان کی تصویریں چھپتی رہتی تھیں، بالخصوص ان کی آخری اہلیہ، بیگم صاحبہ کی جو میرے ملک میں بھی معروف تھیں۔ مگر جیسا کہ توقع کی جاتی تھی ان کے اور ان کے اہلیہ کے بارے میں جو کچھ لکھا جاتا تھا وہ، اگر چہ فضول قسم کے رسائل میں چھپتا تھا، یک طرفہ ہی ہوتا تھا۔ اپنی خودنوشت سوانح حیات کی تمہید میں اس موضوع پر انھوں نے لکھا تھا، ''کسی انسان، ملک کے یا ادارے کے بارے میں افسانہ سازی، اسطور اور دروغ بیانی سے کہیں بہتر حقیقت بیانی ہوتی ہے۔ خود میرے بارے میں، میری زندگی ہی میں افسانہ سازی کی گئی ہے۔''

مجھے ان سے واقعی ہمدردی ہے۔ میرے ہم وطنوں کی نظروں میں ان کی جو تصویر بنی تھی وہ یہ کہ وہ ناقابلِ یقین حد تک دولت کے مالک ہیں، کہ ان جیسا ڈیل ڈول کا آدمی سونے اور ہیروں میں تولا جاتا تھا، کہ ان کی عمر کا بیشتر حصہ گھڑ دوڑ کے میدان میں گزرتا تھا، اور یہ کہ وہ اپنی بیگم کی خوشنودی کے لیے ہر سال کم از کم دو ہفتوں کے لیے طبقۂ امرا میں شامل ہونے کے لیے جرمنی میں واقع Bayreuth جایا کرتے تھے، تاکہ اہلِ ثروت کے حلقوں میں شامل ہوں، واگنر کی موسیقی اور 'اوپرا' سے محظوظ ہوں۔ سمرسٹ ماہم جیسے عظیم ادیب نے بھی آغا خان کی سوانح حیات کے دیباچے میں لکھا تھا: ''عام طور پر لوگ آغا خان کو بالخصوص گھڑ دوڑ کے میدان کا آدمی سمجھتے ہیں، اور یہ قطعی ناممکن نہیں ہوگا کہ جب اس کتاب کے قاری وہ صفحات سنجیدگی سے پڑھیں گے جن میں انھوں نے جانوروں کی نسل افزائی، اور بہت سے کلاسیکی مقابلوں کی جیت کے بارے میں اپنے تجربات بیان کیے ہیں تو ایک لمحے کے لیے حیران رہ جائیں گے۔ حیرانی کی کوئی بات نہیں ہونی چاہیے۔ گھڑ دوڑ ایرانی اشرافیہ کا اہم مشغلہ رہا ہے اور وہ ان کی اولاد میں سے ہیں۔ انھیں تو یہ سب ورثے میں ملا اور وہ اس نوع کے ماحول میں پلے بڑھے ہیں۔''

جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں، مجھے مرحوم آغا خان جیسے لوگوں سے ہمدردی ہے جن کی زندگی کسی جائیداد کی طرح 'زرد صحافت' کی نظر ہوئی ہو۔ مجھے بہت غصہ آتا ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ نام نہاد 'تاریخی' فلمیں بنانے والے اپنے تجارتی مقاصد کے حصول کے لیے حقائق کو اپنی مرضی سے توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں۔ مجھے ایسی باتوں نے ہمیشہ پریشان کیا ہے اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ تاریخی حقائق کا احترام کیا جانا چاہیے۔ اپنے قارئین کی اطلاع کے لیے جو آغا خان کی اصل زندگی سے کم کم واقف رہے ہوں، میں ان کی سوانح حیات سے، ان کے اپنے الفاظ میں، کچھ اقتباسات پیش کرنا چاہوں گا۔ میں کوشش کروں گا کہ جو کچھ میں پیش کروں وہ اس کا خلاصہ ہو جو وہ خود دنیا کو بتانا چاہتے تھے اور کچھ ان کے اپنے متن پر مشتمل ہوگا۔ اس کوشش میں، میں اپنے بیان کو ان کی زندگی کے اس حصے تک محدود رکھنا چاہوں گا جب وہ، صدی کے اختتام تک، ہندوستان کی سیاست اور تحریکِ آزادی میں اہم کردار ادا کر رہے تھے، جس کے بعد انھوں نے اس میں حصہ لینا ترک کر دیا تھا۔

ہمیں بتایا گیا ہے کہ آغا خان ۲ نومبر ۱۸۷۷ء کو کراچی میں پیدا ہوئے تھے اور یہ بھی کہ ان کا لڑکپن اور نوجوانی کا دور بمبئی اور پونے میں گزرا تھا۔ ان کی عمر صرف آٹھ برس کی تھی جب انھیں اپنے دادا کی دولت ورثے میں ملی اور وہ ان کی روحانی رہبری اور اسماعیلی مسلمانوں کی امامت کے رُتبے پر فائز ہوئے۔ نہ صرف یہ کہ ان کے دادا کے ایران کی اشرافیہ کے طبقے اور ایران کی حکمران شاہی سے قریبی تعلقات تھے، ان کی رگوں میں اسلامی دنیا کا شاہی خون بھی گردش کر رہا تھا۔ اس لیے کہ ان کے خاندان کا دعویٰ ہے کہ وہ حضرت محمد، ان کی

صاحب زادی فاطمہ اور ان کے پیارے داماد علی کی اولاد میں سے ہیں۔

بمبئی میں آغا خان کی جائیداد، جس میں وہ بالغ ہوئے تھے، اس صنعتی علاقے میں تھی، جہاں اب بہت گھنی آبادی ہے۔ یہ جائیداد ایک بڑے احاطے پر مشتمل تھی جہاں رفیع الشان محلات، عام درجے کے گھر، خوب صورت باغات، ایک مختصر سا چڑیا گھر اور سیکڑوں گھوڑوں کے لیے اصطبل بنے ہوئے تھے۔ یہاں، یہ واحد وارث، اپنے ہزاروں رشتے داروں، زیر کفالت افراد اور حمایتی لوگوں درمیان قیام پذیر تھا۔

دس برس تک ان کو ایک شدید اور مرتکز نظامِ تعلیم سے گزارا گیا تاکہ ان کو اس متبرک مقام کے لیے تیار کیا جاسکے جس کے لیے وہ پیدا ہوئے تھے۔ آغا خان نے بڑے واضح الفاظ میں خود اس تعلیم کا ذکر کیا ہے جس کے ذریعے ان کو ان ذمے داریوں کے لیے تیار کیا جانا تھا جو انھیں ورثے میں ملی تھیں۔ اور یہ سب کچھ خاندان کی موسمی ہجرتوں کے جدول کے حساب سے ترتیب کیا جاتا تھا۔

انھوں نے لکھا ہے کہ ''ہر سال سردی کے موسم میں، نومبر سے اپریل تک ہم بمبئی میں رہتے، اپریل اور مئی میں مہابلیشور (پونے کے قریب ایک پہاڑی تفریح گاہ ہے۔ مترجم) جون سے اکتوبر تک ہم پونے میں قیام کرتے۔ اکتوبر میں ایک مختصر عرصے کے لیے ہم کسی ایک پہاڑی علاقے جاتے اور واپسی پر بمبئی۔ ۱۸۸۵ء سے ۱۸۹۵ء، دس برس تک اس طے شدہ نظام میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اور اس میں، ایک ماہ، پندرہ دن یا صرف ایک ہفتے کے لیے بھی مجھے تعطیل میسر نہیں ہوتی تھی۔ زیادہ سے زیادہ بس ایک دن۔ اور میں بے دردی کی زنجیروں میں جکڑا رہتا تھا۔

میرے دن رات کے معمولات بغیر کسی تبدیلی کے اسی طرح گزرتے تھے۔ علی الصباح، چھ اور ساڑھے چھ بجے کے درمیان اُٹھنا اور ہلکی چائے، ٹوسٹ، مکھن، جام اور کوئی ایک ایرانی شیرینی سے ناشتا کرنا۔ میں چاہوں یا نہ چاہوں، سات بجے صبح ایک گھنٹے، پونے کے علاقے میں یا ریس کورس میں، یا جب ہم بمبئی میں ہوتے تو ساحلِ سمندر پر سرپٹ دوڑ یا دُلکی چال میں گھڑسواری کرنا، آٹھ سے ساڑھے گیارہ بجے تک مجھے انگریزی اور فرانسیسی کے اساتذہ سے سبق لینا ہوتا تھا۔ اس کے بعد دوپہر کا کھانا اور دو بجے دوپہر تک فراغت۔ اس کے بعد تین گھنٹے عربی کی پڑھائی۔ اس کے بعد سات بجے شام کے کھانے سے قبل، کار سواری، باغ میں ٹینس یا دوسرے قسم کی تفریحات کی اجازت تھی۔ رات کے کھانے کے بعد خوف ناک ترین دور شروع ہوتا تھا۔ دو گھنٹے تک مجھے مشکل ترین اور روح فنا کردینے والی خطاطی کرنی پڑتی تھی۔ میری والدہ عربی اور فارسی کے علما کے اس مشورے سے، جو بعد میں احمقانہ ثابت ہوا، بہت متاثر تھیں کہ کلاسیکی عربی اور فارسی کی خطاطی سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ انھوں یہ بھی بتایا کہ میرے دو سوتیلے بھائیوں کی، جو انتقال کرچکے تھے، تحریر بہت خوب صورت تھی۔ میری والدہ، میرے عم، بلکہ سارے ہی گھر والے مجھ کو ڈراؤنی خطاطی سکھانے پر متحد تھے۔ دراصل میرے لیے یہ شہادت کے برابر تھا، اس لیے کہ کسی کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ میں پیدائشی طور پر اتنا نزدیک بین تھا کہ لکھنے یا پڑھنے کے لیے مجھے کتاب یا کاغذ کو ناک سے دو انچ کے فاصلے پر رکھنا پڑتا تھا۔ چند انچ سے پرے فاصلے کی دنیا میرے لیے بالکل بے کار تھی۔ میرے لیے باغات، پہاڑیاں، سمندر اور جنگل سب بس ایک دھند کے مانند تھے۔ کئی برس تک میری اداسی اور میری اذیت کا کسی کو علم نہ تھا۔ میرے گرد بنائے ہوئے تربیتی حصار کی جکڑ بہت سخت تھی اور جتنا بھی وقت مجھے فرصت کا ملتا اس پر بھی اچانک حملے ہوتے رہتے تھے۔ اس لیے کہ، اگرچہ میں کم سن ہی تھا، پھر بھی مجھے ان عقیدت مندوں سے ملاقات ضروری ہوتی تھی جو بیعت کے لیے آیا کرتے تھے۔ سنیچر اور مذہبی ایام ایسی ملاقاتوں کے مخصوص ہوا کرتے تھے جب مجھ سے ملنے والے باغ میں انتظار کرتے، سلام کرتے، احتراماً جھکتے، تحفے اور نذریں گزرانتے اور نیک تمناؤں کے طالب ہوتے۔ ان محفلوں میں میرا کردار روایتی طور پر معین تھا اور مجھے باُرعب رہنا پڑتا تھا مگر میرے اندر کا بچہ اسے پسند نہیں کرتا تھا کہ یہ سب کچھ چھٹی کے اوقات میں ہوتا، اور کبھی بھی پڑھائی کے اوقات میں نہیں۔''

اتنے سخت نظام الاوقات کے باوجود بھی آغا خان اپنے تین برطانوی اساتذہ سے، جن میں سے دو آئرش تھے، بہت خوش تھے جن

کو ان کی مغربی معاملات کی تربیت کے لیے متعین کیا گیا تھا۔ آغا خان کے الفاظ میں، ''یہ سب بہت نفیس انسان تھے۔ ان کی دی ہوئی تعلیم کسی انداز میں بھی تنگ نظر یا محدود نہیں تھی۔ انھوں نے میرے ذہن کی سطح کو بلند کیا اور باہر کی دنیا کے لیے میری آنکھیں کھول دی تھیں۔ یہ ایسے دانشور تھے جن میں، خواہ وہ سائنس ہو، تاریخ ہو یا سیاست کے مسائل، علم دینے کی امنگ تھی۔ یہ عقل مند اور کھلے ذہن کے مالک لوگ تھے۔ شاید سب سے اہم بات یہ تھی کہ انھوں نے مجھے خود پڑھنے پر اُکسایا، اور اس وقت جب میری عمر صرف دس سال کی تھی، میں اس قابل ہو چکا تھا کہ میں بڑی آسانی سے اپنے ضخیم کتب خانے کی انگریزی، فرانسیسی، فارسی اور عربی کتابوں میں کھو جایا کرتا تھا۔ میرے تینوں اساتذہ نے مجھے علم کے قفل کو کھولنے کی صلاحیت عطا کی اور اس کے لیے میں ہمیشہ سے ان کا شکر گزار رہا ہوں۔

میں ان کے بارے میں اچھے الفاظ کے علاوہ اور کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مگر افسوس کہ عربی اور فارسی پڑھانے والوں کے بارے میں میرے پاس سوائے بُرے الفاظ کے اور کچھ نہیں۔ وہ بہت پڑھے لکھے تھے، ایک جید عالم، جن کو عربی ادب پر اور اسلامی تاریخ پر کافی عبور تھا، مگر اس تعلیم نے ان کے دماغ کو فراخ کیا تھا نہ دل کو گرمی عطا کی تھی۔ وہ ایک کٹر فرقہ پرست آدمی تھے اور باوجود وسیع علمیت کے ان جیسا بے انتہا تاریک ذہن اور تنگ نظر انسان میری نظر سے آج تک نہیں گزرا۔ اگر اسلام وہی کچھ ہے جیسا کہ انھوں نے پڑھایا تھا تو پھر یقیناً خدا نے محمد (صلی اللہ وعلیہ وآلہ وسلّم) کو انسانیت کے لیے نعمت نہیں بلکہ (معاذ اللہ) مصیبت بنا کر بھیجا تھا۔

یہ افسوس کا مقام تھا اور ان کو بات کرتے سن کر خوف آتا تھا۔ ان کو سننے والے کو یہ محسوس ہوتا تھا گویا خدا نے تمام انسانوں کو ابدی ملامت کا حق دار اور جہنّم کا کندا بنانے کے لیے خلق کیا تھا۔ ان کی تمام ترعمیق اور بلیغ علمیت کے شگوفے، اور میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ وہ اس ضمن میں نادرِ روزگار تھے، تلخی اور نفرت کی ہواؤں کے سبب مرجھا گئے تھے۔ بعد میں وہ تہران واپس چلے گئے تھے جہاں پہنچ کر وہ اسلامیات کے عظیم اور معروف استاد ہو گئے تھے اور پورے ایران کے جیّد عالموں میں شمار کیے جانے لگے تھے، مگر میرا خیال ہے کہ آخر وقت تک وہ ویسے ہی کٹر ملاّ رہے ہوں گے جیسا کہ میں نے ان کو پایا تھا۔

شاید میرا ابتدائی تجربہ ہی تھا جس نے مجھے پیشہ ور مذہبی افراد سے، خواہ وہ ملاّ، مولوی، چھوٹے پادری، یا بشپ ہوں، بدظن کر دیا تھا۔ میں مانتا ہوں کہ ان میں سے کئی مثالی شخصیتیں بھی تھیں۔ سیدھے سادے مذہبی لوگ۔ فرانس کے مقامی پیرش کے پادری، اٹلی کے دیہاتوں کے منکسر المزاج پادری، اور دنیا بھر کی حلیم الطبع، متقی اور مہربان نرسیں، جن سے واقفیت ہے، جن کو میں نے پسند کیا ہے اور جن کا میں نے احترام کیا ہے۔

ایران اور عراق میں اسلامی قوانین میں ملاوٹ کرنے والوں کا ایک طبقہ ابھرا ہے جن کا اندازِ نظر اور مزاج میرے پُرانے استاد جیسا تھا، عدم تحمّل، کٹر پن، روحانی جارحیت وغیرہ، جو سرگرمی اور نمائشی انداز میں مالکِ کائنات کے گن گاتے ہیں اور ان سب کو ابدی ملامت کا حق دار اور واصلِ جہنّم کرنے پر تُلے رہتے ہیں سوائے ان کے جو اُن کے اپنے طے شدہ خیالات سے متفق ہوں۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ برسوں میں نے ایسے افراد کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہ حیرت انگیز بھی اور مجھ جیسے لڑکے کے لیے نا مناسب بھی تھا کہ اس کو، جس کی گھریلو نشو ونما ہندوستان کے ماحول میں ہوئی ہو، بلوغت کے دور میں اس نوع کی تنگ نظر اور رسمی اسلامی تلقینِ عقیدہ سے دوچار کیا جائے۔ اس لیے کہ میرا ابتدائی ماحول بے حد برداشت کا تھا۔ ہمارے گھر میں ہندوؤں یا ہندوئیت کے خلاف کبھی کسی قسم کا تعصب نہیں کیا گیا۔''

جب ان کی سوانح حیات کا یہ حصہ میری نظر سے گزرا تو مجھے شدید جھٹکا لگا۔ اس کے باوجود میرے دل میں ان کے لیے تعریف کے جذبات ابھرے تھے۔ اسی وجہ سے میں نے فوراً اس کا مکمل اقتباس دینے کا فیصلہ کیا اس لیے کہ میرے خیال میں چند برسوں بعد جب وہ ہندوستان کی سیاست میں عملی طور پر حصہ لینے لگے تو یہ چند سطریں ان کے اندازِ نظر کے تناظر کو نہایت صریح انداز میں پیش کرنے میں معاون

ہوں گی۔ قبل اس کے ہم اس طرف رجوع کریں، آیئے ہم ان کے پہلے سمندر پار سفر پر چلتے ہیں جو انھوں نے فروری ۱۸۹۸ء میں شروع کیا تھا۔ خود ان کے اپنے خیال میں یہ زمانہ ان کے نزدیک بھی اہم اور فیصلہ کن تھا۔

''میں ۱۸۹۵ء کے آخر اور ۱۸۹۶ء کے شروع میں بلوغت کے مراحل میں تھا۔ اور میرے فرائض کی باگ ڈور پوری طرح میرے ہاتھ میں تھی۔ میرے اساتذہ نے مجھے الوداع کہا اور میری زندگی سے نکل گئے۔ مشرقی رسم کے مطابق اپنی نوجوانی میں ہی میں نے شادی کے بارے میں سوچا۔'' اور ان کی شادی اپنی ایک خوب صورت عم زاد خاتون شہزادی بیگم سے ہوگئی جن کے والد، آغا جنگی شاہ، ان کے عم بھی اور اتالیق بھی تھے۔ آغا خان کے مطابق اگرچہ دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے، پھر بھی شادی ناکامیاب رہی۔ یہ وہی زمانہ تھا جب ان کے عم اور خسر، اپنے ایک بیٹے کے ہمراہ اس وقت قتل کر دیے گئے جب وہ مکّے میں حج کے لیے گئے ہوئے تھے۔ اس بھیانک سانحے نے ان پر گہرا اثر کیا، اس حد تک کہ وہ شدید علیل ہوگئے تھے۔ علالت سے صحت یاب ہونے کے بعد انھوں نے آگرے، دلّی، لاہور وغیرہ میں موجود ہندوستان کے عظیم لوگوں کے مزاروں اور مذہبی مراکز پر حاضری دینے کے لیے طویل سفر اختیار کیا۔ ان مقامات میں اسلامی تہذیب کے عظیم نشانات، تاج محل، دلّی کا لال قلعہ اور جامع مسجد، دلّی اور آگرے کی موتی مسجد وغیرہ بھی شامل تھے۔ وہ علی گڑھ بھی گئے جہاں ان کی ملاقات ہندوستان کے مسلمانوں کی عظیم شخصیات سرسیّد احمد اور نواب محسن الملک سے بھی ہوئی، جنھوں نے مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کے شعلے بھڑکائے تھے۔

بمبئی واپسی کے بعد ان کی خواہش تھی کہ وہ سمندر پار کا لمبا سفر اختیار کریں۔ انھوں نے لکھا ہے، ''مجھے اب سفر میں لطف آنے لگا ہے اور اس کو میں جاری رکھنا چاہتا ہوں۔'' ایک طرح سے اپنی باقاعدہ تعلیم کے اختتام پر وہ یورپ کے لیے عازمِ سفر ہوئے۔ یہ سفر ایک نوع کی اعلیٰ تعلیم کے مماثل تھا جو ۱۹۱۴ء سے قبل کی سماجی زندگی کو اس زندگی سے منسلک کرتا تھا جس میں اشرافیہ اور دولت شاہی، یورپ کے دارالحکومتوں، مونٹے کارلو، کانز، نیس اور سینٹ مارٹز کے شاہی خاندانوں کے گرد گردش کرتی تھی۔ ان کی اس عمر کے بعد کی پرورش ایک طرح سے حکومتِ برطانیہ کے زیرِ سایہ ہوئی۔ مثلاً ملکہ وکٹوریہ سے ملاقات، ایڈورڈ ہفتم کی رفاقت، ملکہ میری سے پچاس برس کی دوستی، شہنشاہ جارج پنجم سے متعدد ملاقاتیں وغیرہ۔ ونسٹن چرچل سے ان کی پہلی ملاقات ۱۸۹۶ء میں پونے میں ہوئی تھی اور اس کے بعد دوستی ہوگئی۔ اس رات جب انھوں نے رات کا کھانا ملکہ وکٹوریہ کے ساتھ تناول کیا تھا اور ۱۹۵۳ء میں جب ملکہ ایلزبتھ دوئم سے ان کے ملاقات چائے کی میز پر ہوئی تھی ایک لمبا، نصف صدی کے برابر، عرصہ تھا کہ تقریباً تمام شاہی، سیاسی اور سماجی عظیم شخصیات سے ان کے رابطے رہے تھے۔

یورپ کے ان تمام مقامات سے جہاں وہ پہلی بار گئے تھے، انھیں لندن نے سب سے زیادہ متاثر کیا تھا۔ اس میں حیرت کی بات اس لیے نہیں کہ ہندوستان کی شاہی شخصیات میں سے ایک اہم شخصیت ہونے کے ناتے برطانوی راج کے خاندان کے ایک فرد کی مثال ان کے ساتھ سلوک کیا جاتا تھا۔ لہٰذا ان کے لیے لندن سب سے اہم مقام تھا۔ اور انیسویں صدی کا لندن آج کے لندن سے بلاشبہ بہت مختلف تھا۔

وہ اپنے قارئین کو بتاتے ہیں کہ ''پچھلی اُنیسویں صدی کے نویں عشرے میں لندن کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے مگر وکٹوریہ کے دور کی تاب ناکی میں اس کے شکوہ، فراہم آسانیوں، تحفظ، فراوانیوں اور خود اعتمادی وغیرہ سے مزیّن مقناطیسی کیفیت کو مزید بڑھا چڑھا کر پیش کرنا ممکن نہیں۔ وہ شہر مہذب دنیا کے مالیات کا مرکز تھا، بے حد متموّل اور نہایت طاقتور۔ ویسٹ منسٹر سے ایک عظیم سلطنت پر حکمرانی ہوتی تھی مگر فیض رساں ضمانت اور یقین دہانی کے ساتھ۔ اگر دفترِ خارجہ بد ہیئت، بھونڈا اور تکلیف دہ تھا، اگر برصغیر کے بارے میں انڈیا آفس کا اندازِ انتظام ظالمانہ اور دقیانوسی تھا تو اس میں حیرت کی بات کیا تھی اس لیے کہ چند ایکڑوں پر پھیلے ان مراکز کے میں کتنے ناقابلِ مزاحمت حساس اختیارات اکٹھے ہوگئے تھے۔ ان اختیارات کے مظاہرے بھی قابلِ دید ہوتے تھے۔ پاؤنڈ اسٹرلنگ سونے کا سکّہ ہوتا تھا، آج ۱۹۵۰ء کے مقابلے میں تقریباً آٹھ گُنا زیادہ قیمتی۔ تنگ دست اور تونگر کے درمیان کے مدارج میں ناقابلِ یقین تفاوت، ایک انتہا سے دوسری انتہا

تک تھا۔ اس کے باوجود معاشرے کے بیش تر حصے میں ایک قسم کا دھندلا احساسِ آسودہ حالی پایا جاتا تھا۔ یہ کوئی خوشحال ریاست نہیں تھی، مگر ایک طرح کا صحت مندانہ احساس ضرور تھا کہ برطانیہ عظیم ہے، خوش مزاجی، دم خم اور لوگوں میں زندگی کے بارے میں مبہم جوئی عام تھی۔

اصل طاقت، سیاسی ہو یا معاشی، چند ہاتھوں میں مرتکز تھی۔ انگلستان اور سلطنت کے حکمراں ایک مخصوص حلقے میں محصور اشرافیہ اور اس دولت مند طبقے کے قبضے میں تھی جو خود کو اشرافیہ کا حصہ منوانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس طبقے سے میرا عہدہ اور میرے احترام انگیز تعلقات قائم ہو چکے تھے جن کے توسط سے میں ان میں براہِ راست داخل ہو سکتا تھا۔''

برسوں تک آغا خان عوامی معاملات میں نمایاں کردار ادا کرتے رہے۔ دنیا کے بارے میں اپنے علم، وسیع سفر، ذاتی وقار اور بین الاقوامی تعلقات کی بنا پر وہ برطانوی حکومت کے لیے 'وزیرِ بے محکمہ' جیسے رُتبے کے قابل تھے۔ پہلی جنگِ عظیم کے دوران اپنے رسوخ کی وجہ سے وہ مسلمان ملکوں کو اتحادیوں کی حمایت پر راضی کر چکے تھے۔ بعد میں ۱۹۳۰ء۔۱۹۳۱ء کے دوران گول میز کانفرنس میں جانے والے اس ہندوستانی وفد کے سربراہ تھے جس نے ہندوستان میں مقامی حکومت بنانے کے لیے راہیں ہموار کی تھیں۔ مقامی سیاست سے علیحدگی کے بعد انھوں نے لیگ آف نیشنز کے لیے بڑی محنت کی اور ۱۹۳۷ء میں اس کے صدر کے عہدے پر فائز ہوئے۔

آغا خان لکھتے ہیں، ''میری زندگی کئی معنوں میں دو بہت مختلف ادوار کے درمیان پُل کی مثال رہی ہے۔ مغرب کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو میں نے وکٹوریائی عہد میں بھرپور زندگی گزاری ہے اور اب ایلزبتھ کے عہد میں بھی ویسی ہی زندگی گزار رہا ہوں۔

میں اس دور میں نہ صرف یہ کہ ایک تماشائی تھا، بلکہ اپنی پیدائش کے حادثے کی بدولت اس میں عملی حصہ بھی لیا ہے۔ میں نے جس قدر انقلاب دیکھا ہے ابھی اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکا ہے مگر انسانی تجربے کی بہت سی سطحوں پر اس کے اثرات نمایاں ہو رہے ہیں۔ پوری دنیا میں تمام تر اندازِ زندگی میں بنیادی اور دوررس تبدیلیاں آئی ہیں۔ میں اس پرانی دنیا میں ایک بالغ انسان تھا۔ ایک وقت تھا جب مشرق کے وسیع علاقوں میں انگلستان حقیقی معنوں میں ایک غیر متازعہ فیہ طاقت تھا اور ہم عصر سیاسی اداروں کے مقابلے میں اس کی ہندوستانی سلطنت سب سے زیادہ مستحکم بنیادوں پر قائم تھی۔ لارڈ کرزن جیسا انسان ہی کیا، نوّے فی صد برطانیہ کی حکومت کے افراد ہندوستانی جمہوریت، یا اس جیسی کسی اور صورت، یا وسیع ہندوستانی سلطنت کی تقسیم، دو مختلف طاقت ور مملکتوں کے قیام اور تاریخی شخصیات کی حکمرانی کے خیال ہی سے خوف زدہ ہو جاتے۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے اختتام تک، جب ہندوستان کو ایک مقامی ریاست کا درجہ دینے کا فیصلہ ہو چکا تھا، اس وقت بھی صاحبانِ اقتدار اس بچکانہ خیال میں مست تھے کہ ہندوستان کی سلطنت کو اس طرح مقامی لوگوں کے ہاتھ میں دے دیا جائے گا جیسے کسی کی موت پر اس کے وارثوں کو جائیداد حوالے کر دی جاتی ہے، اس امید کے ساتھ کہ جائیداد کا بٹوارہ نہیں ہوگا۔ گویا ان کی روحانی اور عقلی بنیادوں میں یہی کچھ جاگزیں ہوگا۔

ان تبدیلیوں میں میرا بھی حصہ تھا۔ مگر میں اس بات پر زور دینا چاہوں گا کہ ہندوستان کے سیاسی اور عوامی معاملات میں میرا جو بھی کردار رہا ہے، وہ میرے بنیادی کام یا فرائض میں سے نہیں تھا۔ بچپن ہی سے میرے لیے جو بات اہم تھی اور میرے نزدیک سب سے بڑی ذمے داری تھی وہ مسلم شیعہ فرقے کی اسماعیلی شاخ کی امامت تھی۔''

لندن کی اپنی پہلی یاترا کے دوران آغا خان نے لندن کو ذرا دور سے دیکھا تھا۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ وہ برطانوی ہند کی سیاست میں فعال ہو گئے تھے۔ تمام یورپ اور مشرقِ وسطیٰ کے بیشتر ممالک کے شہروں کے تفصیلی سفر کے بعد وہ ۱۹۰۲ء میں واپس ہندوستان پہنچے۔ واپسی پر لارڈ کرزن کا لکھا ہوا خط ان کے انتظار میں تھا جس میں ان کو مجلسِ مقننہ کا رُکن بننے کی دعوت دی گئی تھی۔ باوجود ان کے مذہبی عہدے کے، عمر کے تیسرے عشرے میں ایک نوجوان شخص کے لیے یہ بڑے اعزاز کی بات تھی، اس لیے اور بھی کہ یہ مجلس ایک مختصر حلقے کے مماثل تھی جس میں چند صاحبانِ رسوخ ہی ہوتے تھے اور اس رُکنیت کو بڑا اعتبار بھی حاصل ہوتا تھا۔ اس تقرر کی وجہ سے ان کو کلکتے منتقل ہونا پڑا

، اس لیے کہ اس زمانے میں برطانوی اقتدار کا مرکز وہی شہر تھا، اور اس طرح ان کے معمولاتِ زندگی بہت متاثر ہوئے۔ زندگی میں پہلی بار انھیں بہت ذہانت اور لیاقت کے حامل لوگوں کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا اور صحیح معنوں میں ان کو اپنا ذاتی گھر نصیب ہوا۔ بمبئی اور پونے جیسا محل نما ریاستی مکان نہیں جس کے اطراف ہمہ وقت لوگ منڈلاتے رہتے تھے۔ لارڈ کرزن، کمانڈر انچیف لارڈ کچنر جیسے لوگوں کو کام کرتا دیکھنے سے ان کے ذہن میں نئے دریچے وا ہوئے، جی کے گوکھلے جیسے قوم پرست سیاست داں سے رسم و راہ ہوئی بعد کو جن کی گہری دوستی کی بنا پر ان کو ہندوستان کی ان شخصیتوں سے بھی ملنے کے مواقع ملے، گوکھلے جن کے نمائندے تھے۔ ''میں نے دیکھا ہندوستان کی حکومت کتنی الگ تھلگ تھی، صرف ہندوستان کے عوام ہی سے نہیں بلکہ برجستہ گو طبقۂ دانشوراں سے بھی۔ میں نے بہت قریب سے یہ بھی دیکھا کہ ماحول اور جذباتی اعتبار سے حکومت کتنی اجنبی تھی۔ اس کے برعکس میں دیکھ رہا تھا کہ ہندوستان کے سیاسی رہنما اپنے کمتر درجے کے مطالبات کے حصول میں ناکامیابی کے بعد اب صرف انتظامی اُمور کے حصول ہی پر اکتفا نہیں کر رہے تھے بلکہ اب تو وہ مکمل اقتدار اور اپنی سیاسی تقدیر خود لکھنے کے درپے ہو رہے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ میں، ان دو فیصلہ کُن برسوں کے دوران مجھے شدت سے یہ بھی محسوس ہونے لگا تھا کہ ہندوستان کی واحد اور ذمے دار سیاسی پارٹی، یعنی کانگریس پارٹی، ہندوستان کے مسلمانوں کے مفادات کی نمائندگی کرنے کی اہل نہیں رہ گئی تھی، یا یوں کہہ لیجیے کہ کانگریس مسلمانوں کی جائز ضروریات اور توقعات سے کما حقہٗ انصاف کرنے کے قابل نہیں تھی۔ اس پر ہندو انتہا پسندی کا دباؤ بہت شدید تھا۔''

یہ صاف ظاہر تھا کہ آغا خان کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان سیاسی معاملات میں بہ ظاہر اتحادِ عمل اور تعاون کے فقدان پر تشویش تھی اور وہ اپنے علی گڑھ کے دوستوں سے امداد کے طالب تھے، جن سے ان کے روابط ۱۸۹۷ء سے استوار ہوئے تھے جب وہ پہلی بار علی گڑھ تشریف لے گئے تھے۔ اس وقت سے وہ سر سیّد اور نواب محسن الملک کے گہرے معتقد ہو گئے تھے اور اس طرح وہ مسلمانوں کی طاقت اور دانش کی نشاۃ الثانیہ کے سب سے مضبوط مددگار تھے۔ لٰہذا وہ محسن الملک کی طرف متوجہ ہوئے جو مسلمانوں کے ایک سربرآوردہ رہبر کی حیثیت سے سر سیّد کے جانشین تھے اور دوسروں کی طرح یہ دونوں بھی اس بات پر متفق ہو گئے تھے کہ مسلمانوں کو اپنے طور پر ہی کچھ کرنا ہوگا۔ نتیجے میں آغا خان کی سربراہی میں مسلمانوں کے ستر رہنماؤں کا ایک وفد شملے گیا اور اور اس کی ملاقات لارڈ منٹو سے وائسرائے ہاؤس میں ہوئی۔ میں نے یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کے اس تاریخی واقعے کا ذکر کیا ہے جس کے نتیجے میں مسلمانوں کو علیحدہ نمائندگی کا حق ملا اور سارے ہندوستان میں اس پر واویلا مچ گیا۔ حالانکہ جنھوں نے اس سہولت کے لیے تگ و دو کی تھی ان کے نزدیک یہی ایک منطقی طریقہ تھا کہ اس کا پورا فائدہ اٹھانے کے لیے ایک سیاسی ادارہ تشکیل دیا جائے۔ لٰہذا ۱۹۰۶ء میں ڈھاکا میں ہونے والے ایک اجلاس میں آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد رکھی گئی اور آغا خان کو، گو وہ اس وقت ذاتی طور پر وہاں موجود بھی نہ تھے، پہلا صدر منتخب کیا گیا۔ اس عہدے پر وہ ۱۹۱۲ء تک فائز رہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ہندوستان کی مسلم امّہ اور اس کے رہنما ان کی کتنی عزت کرتے تھے۔

اس نوع کی دوررس مصروفیات کے علاوہ آغا خان کو سفر کرنے کا بہت شوق ہو گیا تھا۔ اس لیے کہ اسماعیلی فرقے کے پیشوا ہونے کے ناتے اور ذاتی تعطیل وتفریح کے لیے ان کو تقریباً ہمیشہ ہی سفر در پیش رہتا تھا۔ ۱۹۰۷ء کے بعد سے ہر سال وہ یورپ کا سفر کرتے تھے۔ انھوں نے ایک بار پوری دنیا کا سفر بھی کیا تھا جس کے دوران ان کو پہلی بار ایشیا اور ریاست ہائے متحدہ امریکا بھی جانے کا موقع ملا تھا۔ ان کے اپنے الفاظ میں ''جمالیات کی دنیا میں میرا پہلا عشق موسیقی اور بیلے (ballet) سے تھا۔ زندگی گزرنے کے ساتھ مجھے موسیقی، بیلے، اوپیرا اور تھیٹر سے لگاؤ زیادہ سے زیادہ ہوتا گیا اس لیے کہ ان سے مجھے ذہنی تازگی اور سکون حاصل ہوتا تھا۔ فنون کے معاملے میں میرے نزدیک یہ سب سے اہم ہیں۔''

اس کے باوجود نہ صرف اپنے ماننے والوں کے لیے بلکہ ہندوستان کی سیاست کی ذمہ داریوں کی وجہ سے ان کا زیادہ وقت